جلد ۱۰۸ — جنوری ۱۹۸۸ء — عدد ۵

ماہنامہ

ترجمان القرآن

مؤسس

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی رحمہ اللہ تعالیٰ

ادارۂ ترجمان القرآن، اچھرہ، لاہور

سیرتِ سرورِ عالم ﷺ

مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودیؒ

طویل انتظار کے بعد چھپ کر آگئی ہے۔

جلد اوّل ——— بنیادی مباحث
جلد دوم ——— حضورؐ کی ولادت سے ہجرت تک

- ضخامت جلد اوّل ——— ۷۶۴ صفحات
- ضخامت جلد دوم ——— ۷۶۴ صفحات

دونوں جلدیں نقشے اور تصاویر سے مزین

قیمت فی سیٹ : ۲۰۰/- روپے

فہرست مضامین

جلد ۱۰۸ | جنوری سنہ ۱۹۸۸ء مطابق جمادی الاولیٰ سنہ ۱۴۰۸ھ | عدد ۵

ماہنامہ ترجمان القرآن لاہور

۵ - اے ذیلدار پارک، اچھرہ، لاہور

فون نمبر ——— ۳۲۴۴۶۸

زرِ سالانہ تیس روپے - فی پرچہ -/۳ روپے

سید حسین فاروق مودودی نے ایچ فاروق ایسوسی ایٹس لمیٹڈ لاہور سے چھپوا کر دفتر ترجمان القرآن اچھرہ لاہور سے شائع کیا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

ہم نے آزادی جیسے عطیۂ خداوندی پر حقِ شکر ادا نہ کر کے جن قیمتی چیزوں کو کھو دیا ہے ان میں سے ایک بحث و مکالمہ اور تبادلۂ خیال و استدلال کی کشادہ فضا سے محرومی ہے۔ اِس حادثے کی وجہ کچھ اخلاص کا افلاس ہے اور کچھ علمی ذوق کا فقدان! عصبیتوں اور تحزبات کے غلبے اور انہی کے معیارِ حق قرار پا جانے کی وجہ سے ضمیر متحجر ہو چکے ہیں — "یہ میرا باڑہ" اور وہ "تمہارا باڑہ" — یہ اُس میں نہیں جا سکتا، وہ اِس میں نہیں آ سکتا۔ دونوں اپنے اپنے فکر و مسلک (سیاسی ہو یا مذہبی یا اور کسی طرح کا) کی وکالت بہ آوازِ بلند کرتے ہیں اور دونوں دوسرے ہی کو بہ سرِ غلط قرار دیتے ہیں۔ ہر شخص اپنے آپ کو بر سرِ حق اور اپنی رائے کو صائب سمجھتا ہے اور دوسرے کو پیرو باطل اور اس کے نقطۂ نظر کو ٹیڑھا قرار دیتا ہے۔ پھر ہر کوئی اپنا ارشاد دوسروں پر زبردستی ٹھونسنا چاہتا ہے، اپنے خیالات کا گٹھڑ دوسروں پر لادنا چاہتا ہے۔ بات نہیں بنتی تو طعن و طنز اور تضحیک و تمسخر سے کام لیتا ہے۔ بات آگے چلے تو قسم قسم کے الزام و دشنام کے ہتھیار میانوں سے نکل آتے ہیں، پھر جن لوگوں کے پاس پروپیگنڈے کی مشینری یا طباعت و نشر کا کوئی انتظام ہے تو وہ ہر اختلاف کو اس کے خراد پر چڑھا دیتے ہیں۔ ہماری سیاسی و صحافی دُنیا میں تو بگاڑ عام تھا ہی، اب علمی و ادبی دائرے بھی محفوظ نہیں ہیں۔ آدمی کے لیے بات کرنا مشکل ہو گیا ہے۔

کسی قوم کے عالمِ افکار کی ترقی کا انحصار اس پر ہوتا ہے کہ اس کے لوگ اپنی بات پیش کریں تو محض دلائل کے زور سے پیش کریں۔ اور اعتراض کرنے والے یا اختلاف کرنے والے حضرات بھی دیانت داری کے ساتھ اپنے دلائل سامنے لائیں۔ اپنی بات پیش کرنے والا خود بھی خواہش مند ہو کہ اس کی رائے کی کمزوریاں اس پر واضح ہو جائیں۔ اور فکر کے زیادہ بہتر پہلو اس کے سامنے روشن ہوں۔ اس طرح کسی کی بات کو سننے والے بھی یہ چاہت رکھتے ہوں کہ حق کی کوئی کرن کسی طرف سے آتی ہو تو وہ اُسے بصد شوق قبول کریں اور بات کہنے والے کے طرزِ فکر میں کوئی پیچ وخم محسوس ہو تو پوری خیر خواہی سے یہ چاہیں کہ متکلم کے سوچنے اور بات کرنے کی سطح اور بلند ہو جائے یعنی دونوں طرف خیر خواہی کام کر رہی ہو۔

اس دَور میں جتنی بڑی تباہی دلیل کی واقع ہوئی ہے، اتنی زندگی کے کسی اور پہلو میں نہیں ہوئی۔ دلیل بے وقعت بن کے رہ گئی ہے۔ اس کے مقابلے میں کہیں روپیہ کھڑا ہے، کہیں جاگیر اور جاہ کی قوت، کہیں پروپیگنڈے کا زور، کہیں جتھا بندی کا محاذ، کہیں ذوقِ تشدّد۔ اور باقی ساری قوتوں کا عمل بھی جب دلیل کی تباہی کے لیے ہوتا ہے تو وہ سب تشدّد کو اُبھارتی ہیں۔ اور تشدّد کی باگ ڈور عقل کے ہاتھ میں نہیں، جذبات کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ اس کے حرکت میں لانے کے لیے دلیل درکار نہیں ہوتی نعرہ بازی اور سلوگن درکار ہوتے ہیں۔

سو، غور سے پوری زندگی میں دیکھیے، طرح طرح کے سلوگن ہیں، جذباتیت کے اُبال ہیں، تشدد کی آگ ہے ــــ اور پھر جو چیز زد میں آتی ہے بھسم ہوتی جاتی ہے۔ چاہے وہ ایمان ہو، اخلاق، امن ہو، علم ہو، اتحاد ہو، آزادی کا تحفظ ہو، ملک کی سلامتی ہو، یا دوسرے نقطۂ نظر سے بوڑھے ماؤں اور باپوں پر اولاد کا غم مسلط کر دیا جائے، یا ننھے بچوں کو ان کے والدین، بھائی بہنوں سے محروم کر دیا جائے، یا بیویوں سے ان کے شوہر چھین کر ان کو بیوگی کے گڑھے میں دھکیل دیا جائے، یا کسی کنبے کے سر چھپانے کے خوبصورت مکان یا کچے گھروندے یا گھاس پھونس کے جھونپڑے کو تباہ کر دیا جائے، لوگوں کو ان کے کاروبار اور ذرائع رزق سے محروم کر دیا جائے ــــ اور پھر اس کا نام رکھا جائے سیاست! یا اسے کہا جائے حقوق کی جنگ۔

آپ ذرا اپنی زبان ہی کا مطالعہ کیجیے اس میں کچھ نئے الفاظ داخل ہوتے ہیں۔ مثلاً "عظیم" لینن دیا کچھ اور)، "بے پناہ" مجمع، "تباہ کُن" باؤلنگ، ان الفاظ سے ظاہر ہے کہ مختلف معاملات میں ہماری جذباتیت اتنی شدید ہے کہ اس کے اظہار کے لیے پہلے سے رائج الفاظ بے وقعت ہوگئے اور اب روحِ شدّت سے بھرے ہوئے نئے الفاظ آ گئے۔

اسی طرح واقعات وحقائق کے لحاظ سے ہائی جیکر یا چھاپہ مار، کمانڈو تر، کلاشنکوف کلچر، فضا سے جہاز کا اغوا، انسانی اغوا بہ تاوان کی طلبی، وغیرہ تذکرے آپ روزانہ اخبارات اور رسائل میں پڑھتے ہیں، یہ سارا کھیل نتیجہ ہے دلیل کی شکست کا۔

معاشرے میں ہونے والے اکثر جرائم، سیاسی ہنگامے، پولیس اور مظاہرین کے تصادم، خیانت کا سارا مقبولِ عام کاروبار سب دلیل سے خواہشوں کی بالاتری کا نتیجہ ہے۔

کتنی ہی بحثوں میں حصہ لینا اسی تصور سے مشکل ہوگیا ہے کہ آج تک کبھی کسی ایڈیٹر یا کالم نویس یا دانش ور نے نہ تو ایسی صورت پیدا کی کہ کوئی بھی بحث ہو، فریقین کو برابر کی سہولتیں اور مواقع حاصل ہونے چاہئیں۔ اور نہ کبھی ایسا ہوا کہ کسی اخبار کے ایڈیٹر یا کالم نویس یا اس کے معاون دانشور اہلِ قلم میں سے کسی نے کبھی بحث واستدلال کے دوران یہ تسلیم کیا ہو کہ فلاں صاحب فلاں پہلو سے آپ کی بات کو صحیح تر سمجھتے ہوئے دلی شکریہ کے ساتھ قبول کرتا ہوں یا میں نے فلاں اعتراض جو اٹھایا تھا یا الزام لگایا تھا، اسے واپس لیتا ہوں اور معافی چاہتا ہوں — نہ ایسا کوئی مظاہرہ اصحابِ محراب ومنبر کی طرف سے سامنے آتا ہے۔

لبرل ازم کے معنی ہمارے ہاں یہ ہیں کہ جو جی میں آئے کہے جاؤ، تمھیں لفظوں اور معانی کی جادوگری کا فن آنا چاہیے۔ حالانکہ تصورِ خدا اور تصورِ دین سے آزاد مغربی لبرلزم کو تو اپنی جگہ چھوڑیے، خود اسلام کے دائرے کے اندر یا یوں کہیے کہ حدودِ الٰہی کی پابندی میں اتنا لبرلزم

ہے کہ اس کی کہیں اور مثال نہیں ملتی۔ یہاں تو ہر بات پر مطالبہ ہے "هَاتُوا بُرْهَانَكُمْ" اور یہاں اُصول یہ ہے کہ کسی کی زندگی اور کسی کی ہلاکت " بیّنہ " پر مبنی ہونی چاہیے۔

لیکن افسوس ناک بات یہ ہے کہ خود داعیانِ اسلام اور واعظانِ اسلام میں برہان اور بیّنہ کی پوری اہمیت کا احساس موجود نہیں ہے۔ ان حضرات کے گروہ اور جتھے بھی اور ان کے اکابر اور بزرگ اور پیر بھی اپنی جلالتِ شان سے دلیل کا زور توڑ دیتے ہیں۔

تو دین والو اور دنیا والو! علم و ادب والو اور اخباروں والو! حکومت والو اور سیاسی جماعتوں والو! خدا کے لیے مکالمہ و تبادلۂ خیال میں دلیل کے اُصول کو از سرِ نو قائم کرو۔

ورنہ جہاں دلیل کو تباہ کر دیا جائے وہاں کچھ بھی نہیں بچتا۔

معذرت

اِس مہینے کچھ ایسی معذوریاں درپیش رہیں کہ بہ مشکل رسالے کی تیاری ہوئی اور وہ بھی لیٹ۔ خاص طور پر اس بات کا افسوس ہے کہ "مطبوعات" کے صفحوں میں کتابوں پر رائے لکھنے کا کام نہیں ہو سکا۔ نیز خطوط کے جواب دینے کا کام بھی معرضِ التوا میں ہے۔ (ملک رضی)

رزقِ حلال

جناب سید اسعد گیلانی صاحب

(۳)

ظاہر ہے کہ دینِ حق کی خاطر جب کوئی مومن جدوجہد کرتا ہے تو نظامِ باطل کی طرف سے اس پر آزمائش آتی ہے۔ کبھی اُسے فراہم شدہ رزق سے محروم کر دیا جاتا ہے اور کبھی اسے گھر بار سے ہی نکال دیا جاتا ہے۔ تاریخِ دعوتِ اسلامی میں مخالفینِ حق مزاحمتِ حق کے لیے بڑی سے بڑی کارروائیاں کرتے رہے ہیں تاکہ علمبردارانِ حق اپنے مقصد اور کام سے باز آجائیں۔ ان مخالفانہ کارروائیوں میں انہیں وسائلِ رزق سے محروم کرنا، ان کے بال بچوں کو ان کی سرپرستی سے اور خود ان سے رزق کی سہولتیں چھین لینا خصوصاً شامل رہا ہے، کبھی کاروبار تباہ کر کے اور کبھی گھر بار چھڑوا کر۔ ایسی صورت میں ایک بندۂ مومن اس ذہنی مغالطے میں مبتلا ہو سکتا ہے کہ اس کے رزق کا معاملہ خود اس سے نہیں بلکہ اس کے کنبہ اور خاندان سے بھی تعلق رکھتا ہے اور یوں بہت سی تاویلیں اس کا نفس حق کے کام سے پہلوتہی کی سوچنے لگتا ہے۔

لیکن اللہ تعالیٰ تو فرماتا ہے کہ وہ کونسا جاندار ہے جو اپنا رزق اپنے کندھوں پر اُٹھائے پھرتا ہے اور اپنے زور اور اپنی قوت سے خود رزق حاصل کرتا ہے۔ یہ رزق تو اُس کا خدا ہی ہے جو اُسے دیتا ہے۔ اگر وہ کیڑوں، مکھیوں، مچھروں اور جھینگروں کا رازق ہے تو تم تو ان سے بہت زیادہ اس بات کے حق دار ہو کہ تمہیں رزق مہیا کیا جائے۔

اگر تم اپنے مالک کی خاطر اس کی معروف رضا کے لیے باطل کے مقابل بلاخوف و خطر ڈٹ جاؤ گے تو اللہ تعالیٰ جو رب العالمین ہے وہ تمہیں ضرور پال لے گا۔ اور تم راہِ حق میں جدھر جاؤ گے اپنے رب کا دسترخوان ہر جگہ اپنے سامنے پھیلا ہوا پاؤ گے۔

اس بات کو حضرت عیسیٰؑ نے اپنے حواریوں سے کہا تھا جب دعوتِ دین کے سلسلے میں ان پر تکالیف آئیں۔ اور بنی اسرائیل نے ان پر زندگی کی کشادگی تنگ کرنی شروع کر دی تو انہوں نے اپنے حواریوں سے فرمایا:

"کوئی آدمی دو مالکوں کی خدمت نہیں کر سکتا کیونکہ یا تو ایک سے عداوت رکھے گا اور دوسرے سے محبت یا ایک سے ملا رہے گا اور دوسرے کو ناچیز جانے گا۔ اس لیے میں کہتا ہوں کہ اپنی جان کی فکر نہ کرنا کہ ہم کیا کھائیں گے اور کیا پئیں گے اور نہ اپنے بدن کی کہ کیا پہنیں گے؟ کیا جان خوراک سے اور بدن پوشاک سے بڑھ کر نہیں ہے؟ ہوا کے پرندوں کو دیکھو کہ نہ بوتے ہیں، نہ کاٹتے ہیں، نہ کوٹھیوں میں جمع کرتے ہیں پھر بھی تمہارا آسمانی باپ ان کو کھلاتا ہے۔ کیا تم ان سے زیادہ قدر نہیں رکھتے جب خدا میدان کی گھاس کو، جو آج ہے اور کل تنور میں جھونکی جائے گی، ایسی پوشاک پہناتا ہے تو اے کم اعتقادو! تم کو کیوں نہ پہنائے گا"

یہ حقیقت ہے کہ ہر معاشرے میں کھاتے پیتے لوگ ہی اصل فساد کی جڑ ہوتے ہیں اور رزقِ حرام کی بڑی مقدار ایسے ہی خوش حال لوگوں میں گردش پاتی ہے۔ رزقِ حلال کے لیے جو محنت اور احتیاط درکار ہوتی ہے نفس کے بندے وہ احتیاط کرنے سے گریز کرتے ہیں۔ قرآن مجید نے کہا ہے:

"کبھی ایسا نہیں ہوا کہ ہم نے کسی بستی میں ایک خبردار کرنے والا بھیجا ہو اور اس بستی کے کھاتے پیتے لوگوں نے یہ نہ کہا ہو کہ جو پیغام تم لے کر آئے ہو اس کو ہم نہیں مانتے (سورہ سبا۔ آیت: ۳۴)

یہ بات انہوں نے اس لیے کہی کہ وہ مامور تھے اور اس لیے کہی کہ ان کا ذریعہ معاش

رزقِ حرام تھا۔ رزقِ حرام کی خاصیت یہ ہوتی ہے کہ وہ حق کو تسلیم کرنے میں زبردست رکاوٹ بن جاتا ہے۔ رزقِ حرام کھا کر انسان خدا کا کام نہیں کر سکتا۔ پھر وہ جسم دوزخ میں جلنے کے قابل تو ہو جاتا ہے لیکن اللہ کی فوج کا سپاہی نہیں بن سکتا۔ اس کا یہ خیال ہوتا ہے کہ چونکہ ہمارے پاس زیادہ رزق ہے۔ زیادہ مال و دولت اور قوت و اقتدار ہے اس لیے ہم خود بخود زیادہ اللہ کے پیارے لوگ ہیں، تبھی تو اس نے ہمیں ان نعمتوں سے نوازا ہے۔ اگر اللہ ہم سے راضی نہ ہوتا تو یہ مال و دولت وحشمت اور یہ شان و شوکت ہمیں کیوں دیتا۔ قرآن نے ان دُنیا پرستوں کی جا بجا تردید کی ہے اور کہا ہے کہ دُنیا میں رزق کی تقسیم کا انتظام جس حکمت و مصلحت پر مبنی ہے اس کو یہ لوگ نہیں سمجھتے اور اس غلط فہمی میں پڑے ہوئے ہیں کہ جسے اللہ کشادہ رزق دے رہا ہے وہ اس کا محبوب ہے اور جسے تنگی کے ساتھ دے رہا ہے وہ اس کے غضب میں مبتلا ہے۔ حالانکہ اگر کوئی شخص آنکھیں کھول کر دیکھے تو اُسے نظر آ سکتا ہے کہ بسا اوقات بڑے ناپاک اور گھناؤنے کردار کے لوگ بڑے خوشحال ہوتے ہیں اور بہت سے نیک اور شریف انسان جن کے کردار کی خوبی کا ہر شخص کو اعتراف ہوتا ہے، وہ تنگی میں مبتلا ہوتے ہیں۔ اب کون آخر صاحبِ عقل آدمی یہ بات کہہ سکتا ہے کہ اللہ کو یہ پاکیزہ اخلاق کے لوگ تو ناپسند ہیں اور وہ شریر اور خبیث لوگ ہی اسے بھلے لگتے ہیں۔

درحقیقت رزق کی کمی بیشی اللہ کی مشیت سے تعلق رکھتی ہے نہ کہ اس کی رضا سے۔ مشیتِ الٰہی کے تحت ہر قسم کے انسانوں کو رزق مل رہا ہے۔ انکارِ خدا اور اقرارِ خدا کرنے والے سب رزق پا رہے ہیں۔ نہ رزق کی فراوانی اس بات کی دلیل ہے کہ آدمی خدا کا پسندیدہ ہے اور نہ اس کی تنگی اس بات کی علامت ہے کہ آدمی اس کا معتوب ہے۔ مشیتِ الٰہی کے تحت ایک ظالم اور بے ایمان آدمی بھی پھلتا پھولتا ہے حالانکہ ظلم اور بے ایمانی خدا کو پسند نہیں ہے اور اس کے برعکس مشیت ہی کے تحت ایک سچا اور ایماندار آدمی نقصان اُٹھاتا اور تکلیفیں سہتا ہے، حالانکہ یہ صفات خدا کو پسند ہیں۔ لہٰذا وہ شخص سخت گمراہ ہے جو مادی فوائد و منافع کو خیر و شر اور اچھائی بُرائی کا پیمانہ قرار دیتا ہے۔ اصل چیز خدا کی رضا ہے اور وہ

ان اخلاقی اوصاف سے حاصل ہوتی ہے جو خدا کو محبوب ہیں جن میں رزقِ حلال کا حصول بھی ہے۔ اگر کوئی شخص خدا کا باغی اور نافرمان بھی ہے اور ساتھ ہی خدا کی نعمتوں سے نوازا جا رہا ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ شخص سخت باز پرس اور بدترین عذاب کے لیے تیار کیا جا رہا ہے۔

بعض لوگ رزق کی مساوات کا تذکرہ کرتے ہیں اور مارکسی تصورِ اشتراکیت کو اسلامی رنگ دینے کے لیے اسے قرآنی نظامِ ربوبیت بنا کر پیش کرتے ہیں اور قرآن کے لفظ "سَوَاءً لِّلسَّائِلِيْنَ" کا ترجمہ سب مانگنے والوں کے لیے برابر کرتے ہیں اور پھر اس سے یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ اللہ نے زمین میں سب لوگوں کے لیے برابر خوراک رکھی ہے اور اس منشا کو پورا کرنے کے لیے وہ ایک ایسی ریاست کا نظام پیش کرتے ہیں۔ جو سب کو غذا کا مساوی راشن دے۔ کیونکہ انفرادی ملکیت کے نظام میں وہ مساوات قائم نہیں ہو سکتی۔ لیکن یہ لوگ جوشِ اشتراکیت میں یہ بھول جاتے ہیں کہ قدرت کے دسترخوان کے سائلین صرف انسان ہی نہیں بلکہ مختلف اقسام کی وہ سب مخلوقات ہیں جنھیں زندہ رہنے کے لیے غذا کی ضرورت ہے۔ کیا ان سب کے درمیان یا ایک ایک قسم کی مخلوقات کے تمام افراد کے درمیان خدا نے سامانِ پرورش میں مساوات رکھی ہے۔ کیا خدا کے اس پورے نظامِ رزق میں کہیں کسی کو غذا کے مساوی راشن کی تقسیم کا انتظام نظر آتا ہے؟ ظاہر ہے کہ ان سائلین میں وہ حیوانات بھی شامل ہیں۔ جنھیں انسان پالتا ہے اور جن کی خوراک کا انتظام خود انسان کے ذمہ ہے۔ بھیڑ، بکری، اونٹ، مرغی وغیرہ تو کیا ان سب سائلین کو برابر اور یکساں خوراک دی جائے گی۔ کیا نظامِ ربوبیت والی ریاست انسان اور ان حیوانات کے درمیان بھی معاشی مساوات قائم کرے گی۔

رزقِ حلال کو خرچ کرنے کے معاملے میں بھی اسلام نے مومنین کے لیے تین طرزِ عمل متعین کیے ہیں۔ اول یہ کہ وہ خرچ کرتے ہیں اسی رزقِ حلال میں سے جو انھیں دیا گیا ہے۔ وہ اپنے اخراجات کے لیے مالِ حرام پر ہاتھ نہیں مارتے۔

دوسرے یہ کہ وہ خدا کے دیئے ہوئے رزق کو سمیٹ سمیٹ کر نہیں رکھتے بلکہ اسے خرچ

کردیتے ہیں۔ تیسرے یہ کہ جو رزق انہیں دیا گیا ہے اس میں سے راہِ خدا میں بھی خرچ کرتے ہیں، سب کچھ اپنی ذات پر ہی صرف نہیں کر دیتے۔

سورۂ بنی اسرائیل میں اللہ تعالیٰ نے ۱۴ احکام ایسے دیے ہیں جن کے ذریعے مومن کے سامنے اس کی زندگی کا ہمہ پہلو چارٹ منفتل آجاتا ہے جس میں رزق اور دوسرے معاملات کے بارے میں متوازن ہدایات ہیں۔ ایسا ہی نظام رزقِ حلال کا ضامن بن سکتا ہے۔ وہ چودہ نکات یہ ہیں:

۱۔ تم اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو۔

۲۔ والدین کے ساتھ نیک سلوک کرو اور ان سے اُف تک نہ کہو۔

۳۔ رشتہ دار کو اس کا حق دو اور مسکین اور مسافر کو اس کا حق دو۔

۴۔ فضول خرچی نہ کرو، فضول خرچ لوگ شیطان کے بھائی ہیں اور شیطان اپنے رب کا ناشکرا ہے۔

۵۔ حاجت مندوں کو مجبوری سے جواب ہی دینا پڑے تو نرم الفاظ میں جواب دو۔

۶۔ نہ اپنا ہاتھ گردن سے باندھ لو (بخل کے لیے) اور نہ بالکل ہی کھلا چھوڑ دو۔ (اسراف کے لیے) کہ عاجز ہی بن کر رہ جاؤ۔ اللہ اس کا رزق کشادہ کر دیتا ہے جس کا چاہتا ہے

۷۔ اپنی اولاد کو اندیشۂ افلاس سے قتل نہ کرو۔ ہم اُن کو بھی رزق دیں گے اور تم کو بھی۔

۸۔ زنا کے قریب نہ پھٹکو، یہ بہت ہی بُرا راستہ ہے۔

۹۔ قتلِ نفس کے ارتکاب سے بچو۔

۱۰۔ مالِ یتیم کے پاس بھی نہ پھٹکو۔

۱۱۔ اپنے قول و قرار کی پابندی کرو، ہر عہد کی جوابدہی ہوگی۔

۱۲۔ پیمانوں سے پورا پورا ناپ تول کرو۔

۱۳۔ بغیر علم کسی چیز کے پیچھے نہ پڑو، آنکھ، کان، دل سب کی بازپرس ہوگی۔

۱۴۔ زمین میں اکڑ کر نہ چلو، تم نہ زمین کو پھاڑ سکتے ہو اور نہ پہاڑوں کی بلندی کو پہنچ سکتے ہو۔

اِن اصولوں پر جو نظامِ زندگی قائم کیا جائے وہی رزقِ حلال کی ضمانت دے سکتا ہے۔ غرض رزقِ حلال کی اس بحث میں ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ رزقِ حلال کا بہت بڑا تعلق انسان کے اخلاص و ایمان سے بھی ہے، جو شخص سچے دل سے خدا پر ایمان رکھتا ہو اور اسی کو رزق کے خزانوں کا مالک سمجھتا ہو وہ کبھی اس کم ظرفی میں مبتلا نہیں ہو سکتا، جس میں خدا کو بھولے ہوئے لوگ مبتلا ہو جاتے ہیں۔ اسے کشادہ رزق ملے تو پھولے گا نہیں بلکہ شکر کرے گا۔ خلقِ خدا کے سامنے تواضع اور خوش خلقی اور فیاضی سے پیش آئے گا۔ اور خدا کا مال خدا کی راہ میں خرچ کرنے سے دریغ نہ کرے گا۔ اگر تنگی کے ساتھ رزق ملے تب بھی وہ صبر سے کام لے گا اور دیانت و امانت کو کبھی ہاتھ سے نہ جانے دے گا اور آخر وقت تک خدا کے فضل و کرم کی آس لگائے رکھے گا۔ یہ اخلاقی بلندی نہ رزقِ حرام کھانے والے کسی دہریے کو نصیب ہو سکتی ہے اور نہ کسی مشرک کو۔

رزقِ حلال اور رزقِ حرام کے پس منظر میں ہم حضورِ اکرم کی اس حدیث پر غور فرمائیں تو زندگی کی راہیں روشن ہو جاتی ہیں۔ جب حضرت ابن معبدؓ نے حضورِ اکرم سے نیکی اور گناہ کے بارے میں سوال کیا تو آپؐ نے فرمایا "اے معبد اپنے نفس سے پوچھ، اپنے دل سے پوچھ، نیکی وہ ہے جس سے دل کو اطمینان حاصل ہو، سکون حاصل ہو اور گناہ وہ ہے جو نفس میں خلش پیدا کرے"۔

امام احمد بن حنبل نے خوب فرمایا کہ سب سے بڑی نیکی رزقِ حلال کا حصول ہے۔

اقبال اور نفاذِ شریعت

(جناب جسٹس جاوید اقبال کے بعض افکار پر ایک نظر)

جناب محمد امین صاحب

۲۲ر اپریل ۱۹۸۶ء کے اخبارات میں یومِ اقبال کے موقع پر فرزندِ اقبال جناب جسٹس ڈاکٹر جاوید اقبال کی جو تقریر رپورٹ ہوئی ہے، اس کے مطابق انہوں نے کہا "عبادات اور معاملات قطعی طور پر دو الگ الگ چیزیں ہیں، حکیم الامت نے معاملات میں اجتہاد کی تلقین کی ہے عبادات میں نہیں"۔۔۔ یہی بات انہوں نے ذرا وضاحت سے یکم اکتوبر ۱۹۸۶ء کو ایک تقریب میں اخبار نویسوں سے بات چیت کرتے ہوئے کہی تھی جب انہوں نے فرمایا "عبادات اور معاملات میں نمایاں فرق ہے۔ اور ان قرآنی احکام میں تبدیلی کی کوئی گنجائش موجود نہیں ہے، جن کا تعلق زیادہ تر عبادات سے ہو۔ تاہم جن احکام کا تعلق معاملات سے ہو، ان میں وقت کی ضرورت کے مطابق نئی تعبیریں کی جا سکتی ہیں"۔ اسی طرح ۲۷ دسمبر ۱۹۸۶ء کے اخبارات میں جناب صدر ضیاء الحق کا وہ بیان بھی اخبارات میں چھپا ہے جس میں انہوں نے سپریم کورٹ کے جسٹس جاوید اقبال کے اس موقف پر تبصرہ کرتے ہوئے کہ "ہاتھ کاٹنے اور سنگسار کرنے کی سزا جابرانہ ہے لہٰذا اس قسم کے قوانین ختم کر دیے جائیں" یہ یقین دلایا ہے کہ قرآنی سزاؤں کو ختم نہیں کیا جائے گا۔ ازیں پیشتر ہمیں وہ بیان بھی دیکھنے کا موقع ملا تھا جس میں سرگودھا بار سے خطاب کرتے ہوئے جناب جاوید اقبال نے یہ مطالبہ کیا تھا کہ اجتہاد کے لیے عربی زبان جاننے کی شرط ختم ہونی چاہیے اور وکلاء کو حقِ اجتہاد ملنا چاہیے۔

اگر یہ آرا کسی کمیونسٹ دانشور، سیکولر سوچ رکھنے والے کسی بیوروکریٹ یا کسی سوشلسٹ سیاسی لیڈر کی ہوتیں تو ہم خاموش رہتے، لیکن چونکہ یہ آرا حکیم الاُمت اور مفکرِ اسلام و پاکستان حضرت علامہ اقبالؒ کے فرزندِ ارجمند حضرتِ جاوید اقبال کی ہیں، جو اقبالؒ کے مادی ہی نہیں ان کی معنوی فکر کے وارث بھی ہیں، جو پاکستان کی سب سے بڑی عدالت کے جج ہی نہیں، پی ایچ ڈی بھی ہیں۔ اور غالباً ان کی نسبت کی رفعت اور منصب کی بلندی ہی کا اثر ہے کہ لوگ اُن کی آرا جاننے کے باوجود احتراماً خاموش رہے ہیں۔ ورنہ کوئی اور آدمی ہوتا تو اس کا وہی حشر ہو سکتا تھا جو ڈاکٹر فضل الرحمٰن کا ہوا۔

خود ہمیں بھی جناب جاوید اقبال کی تکریم ہر لحاظ سے اور ہر درجہ میں محبوب ہے لیکن اگر احساس یہ ہو کہ ان کا موقف شریعتِ مطہرہ کے موقف سے ٹکرا رہا ہے تو پھر ظاہر ہے کہ خدا و رسولؐ کی عزت ساری عزتوں سے اور ان کی محبت ساری محبتوں سے بڑھ کر ہمیں بھی عزیز ہے اور ہر مسلمان کو بھی عزیز ہونی چاہیے، چنانچہ قصہ درد سُناتے ہیں کہ مجبور ہیں ہم۔ اور جناب جاوید اقبال سے پیشگی معذرت کہ مقطع میں آ پڑی ہے سخن گسترانہ بات۔

فقہ اسلامی کا ایک ادنیٰ طالب علم ہونے کے ناطے سے ہم یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ فقہ اسلامی سے متعلق جناب جاوید اقبال کی مذکورہ آرا میں کوئی وزن نہیں۔ ان کے دلائل اتنے کمزور ہیں کہ ان پر بحث کرنے میں کوئی لطف نہیں، وہ اتنے پُرانے ہیں کہ ان کا جواب دینے میں کوئی جدت نہیں، تاہم چونکہ یہ ایک ایسے شخص کی طرف سے پیش کیے گئے ہیں جس کا اسلامی، علمی اور قانونی حلقوں میں ایک مقام ہے لہٰذا یہ چند سطور حاضرِ خدمت ہیں۔

فکرِ اقبال کے حوالے سے جناب جسٹس جاوید اقبال کا موقف یہ ہے کہ عبادات کے علاوہ قرآن کے وہ احکام جو معاملات سے متعلق ہیں سب قابلِ تغیر ہیں اور ان میں اجتہاد کیا جا سکتا ہے۔ ہم یہ سمجھنے سے قاصر ہیں کہ جناب کے اس موقف کی سند اور ماخذ کیا ہے؟ جس آدمی نے بھی اسلامی شریعت اور فقہ کا مطالعہ کیا ہے وہ جانتا ہے کہ معاملات میں خدا اور رسولؐ کے احکام دو طرح کے ہیں ایک وہ جن کی تفصیلات قرآن و سنت میں آگئی ہیں اور یہ عام طور پر ایسے احکام ہیں، جو سوسائٹی کا ڈھانچہ برقرار رکھنے کے لیے انتہائی ضروری

ہیں۔ مثلاً حفظِ نسل (زنا)، حفظِ مال (امن، چوری، ڈکیتی)، حفظِ عقل (شراب نوشی وغیرہ) اور حفظِ عزت وناموس (قذف) وغیرہ۔ ان کے بغیر انسانی معاشرہ صالح بنیادوں پہ کھڑا ہو ہی نہیں سکتا، یا پھر معاملات کے وہ پہلو جن کی تفصیلات کا صحیح صحیح تعین کرنا انسانی بس میں نہیں مثلاً نکاح وطلاق اور وراثت کے امور۔ اس کے علاوہ معاملات میں شارع کا عمومی اسلوب یہی ہے کہ وہ بنیادی اصول وقواعد بیان کر دینے پہ اکتفا کرتا ہے اور یہ بات مسلمانوں کے اصحابِ اجتہاد پر چھوڑ دیتا ہے کہ وہ ہر معاشرے میں اپنے ماحول کی ضروریات کے مطابق اس کی تفصیلات شریعت کے بنیادی احکام اور اس کے مقاصد ومزاج کی روشنی میں طے کرلیں۔

اسی طرح شریعت کا ہر سنجیدہ طالب علم یہ بھی جانتا ہے کہ اجتہاد کا دائرۂ کار کیا ہے؟ اجتہاد کا دائرۂ کار یہ ہے ہی نہیں کہ وہ قرآن وسنت میں بیان کردہ احکام کو تبدیل کرے۔ منصوص احکام میں اجتہاد کی گنجائش صرف اتنی ہے کہ اگر نص کے الفاظ ایک سے زیادہ معنی ومفہوم کے محتمل ہوں تو ان میں سے راجح تر کا تعین کیا جائے یا ان احکام کی تطبیق کے لیے جن تفصیلی احکام اور پروسیجرل ضوابط کی ضرورت ہو تو ان کو بنا لیا جائے، ورنہ کوئی مسلمان یہ تصور بھی نہیں کرسکتا کہ وہ خدا ورسولؐ کے احکام کو بدل سکتا ہے۔ غیر منصوص احکام میں اجتہاد کی گنجائش یہ ہے کہ قرآن وسنت کی نصوص پہ قیاس کرتے ہوئے اور مقاصدِ شریعت کی روشنی میں، نیز مسلمانوں کے مفاد ومصالح کی خاطر اور استنباط واستخراج کے ان طریقوں پہ عمل کرتے ہوئے جن کی اجازت قرآن وسنت سے ملتی نظر آتی ہے، اجتہاد کیا جاسکتا ہے۔

ہم آنجناب کی توجہ دو ایسے قانونی قاعدوں کی طرف بھی مبذول کرانا چاہتے ہیں جو اسلامی اصولِ فقہ ہی کے نہیں موجودہ اصولِ قوانین کے نزدیک بھی معتبر بلکہ متداول ہیں۔ ان میں سے پہلا قاعدہ تو یہ ہے کہ کسی اتھارٹی کے وضع کردہ قانون کو صرف وہی اتھارٹی خود یا اس سے بالاتر اتھارٹی ہی ختم کرسکتی ہے۔ جیسے پاکستان میں پارلیمنٹ کے بنائے ہوئے کسی قانون کو کوئی صوبائی اسمبلی ختم نہیں کرسکتی، یا سپریم کورٹ کے کسی فیصلے کو کوئی سیشن عدالت ختم نہیں کرسکتی۔ اسی طرح قرآن کے کسی فیصلے کو قرآن ہی منسوخ کرسکتا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنے فیصلے کو خود تو بدل سکتے ہیں لیکن کسی امتی کا یہ مقام نہیں ہے کہ وہ ان کو بدل سکے۔ بدلنا

تو ایک طرف رہا، قرآن تو یہ کہتا ہے کہ اگر تم ان کے فیصلے کو تہہ دل سے برضا و رغبت تسلیم نہیں کرو گے تو تم سرے سے مومن ہی نہیں ہو۔ (النساء - ۶۵)

دوسری بات یہ کہ جسٹس صاحب غالباً جس چیز پر زور دینا چاہتے ہیں وہ یہ ہے کہ قانون کو جامد نہیں ہونا چاہیے۔ بلکہ اس میں اتنی لچک ہونی چاہیے کہ وہ بدلتے ہوئے حالات کا ساتھ دے سکے۔ ان کی یہ خواہش بالکل بجا ہے لیکن سمجھنے کی بات صرف اتنی ہے کہ اسلام کے نظامِ قانون میں یہ خوبی موجود ہے یا نہیں؛ جیسا کہ ابھی ہم نے ذکر کیا کہ معاملات کی حد تک اسلام میں ناقابلِ تغیر قانونی احکام صرف وہ ہیں جو سوسائٹی کا ڈھانچہ برقرار رکھنے کے لیے ضروری ہیں۔ یا پھر ان تفصیلات تک محدود ہیں جن کا تعین کرنا عقلِ انسانی کے بس میں نہیں، جیسے شخصی قوانین وغیرہ۔ ورنہ زندگی کے دیگر سارے معاملات میں اجتہاد کی بہت زیادہ گنجائش ہے۔ اور یہ شارع نے عمداً اسی حکمت کے پیش نظر چھوڑی ہے کہ مسلمانوں کو تنگی محسوس نہ ہو اور وہ بدلے ہوئے حالات میں اجتہاد کر سکیں یا پہلے کے بنائے ہوئے اجتہادی قوانین میں تبدیلی کر سکیں قرآن و سنت کی نصوص میں اجتہاد کی گنجائش ان کی تطبیق اور تعبیر میں ہے، ان کے تغیر و تبدل میں نہیں۔ حضرت عمرؓ کی مثالیں بعض لوگ اس غلط فہمی میں دیتے ہیں کہ گویا حضرت عمرؓ نے قحط کے زمانے میں قطعِ ید کی سزا ختم کر دی تھی یا مؤلفۃ القلوب کی مد ختم کر دی تھی۔ حالانکہ یہ بالکل ہی غلط ہے، اگر ان واقعات کی غیر جانب دارانہ علمی تحقیق کی جائے (جو بہت سے لوگوں نے پہلے کی ہے)، تو اس سے یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ حضرت عمرؓ نے قرآنی احکام کو تبدیل نہیں کیا، بلکہ خود قرآن و سنت میں ان احکام کے الفاظ و معانی میں اس مفہوم کی گنجائش موجود تھی جس کو انہوں نے اختیار کیا تھا ــــــ اس کے باوجود اگر جسٹس صاحب یہ سمجھتے ہیں کہ قانون کے اندر کوئی مستقل بالذات قدر ہونی ہی نہیں چاہیے۔ اور قانون سارے کا سارا ہمیشہ ہی قابلِ تغیر ہونا چاہیے تو ہم ان کی توجہ ان مغربی اقوام کی طرف مبذول کرانا چاہیں گے، جہاں اس طرح کہ مستقل اقدار نہیں ہیں اور قانون وہاں بازیچۂ اطفال بنا ہوا ہے، خود امریکہ جیسے ممالک میں پہلے شراب کی اجازت تھی۔ پھر پابندی لگائی گئی، پھر یہ پابندی ہٹا دی گئی، لواطت اکثر مغربی ممالک میں غیر قانونی ہے جب کہ بعض ملک اسے قانونی قرار دے چکے ہیں، بعض ملکوں

میں موت کی سزا دی جا سکتی ہے بعض میں نہیں۔ ہماری رائے میں مستقل قانونی اقدار کا وجود عقلی لحاظ سے بھی ہمارے نظامِ قانون کی ایک خوبی ہے نقص نہیں، اس سے قطع نظر ان پر ایمان لانا اور عمل کرنا ہمارے ایمان کا حصہ بھی ہے۔

۲۔ جسٹس صاحب کا ایک موقف یہ بھی ہے کہ حدیں نافذ کرنے والا قانون جابرانہ ہے، اسے ختم ہونا چاہیے۔ اس کا ایک جواب تو اُوپر آ چکا کہ ہمیں قانوناً اس چیز کا حق نہیں ہے کہ ایک بالاتر اتھارٹی کا وضع کردہ قانون ختم کر سکیں اور دوسرے ہمارے ایمان اور اسلامی حمیت کا بھی یہ تقاضا ہے کہ ہم خدا کے احکام پر عمل درآمد کریں نہ کہ انہیں اس لئے بدلنے کی کوشش کریں کہ اس پر بعض غیر مسلموں کو اعتراض ہو سکتا ہے۔ آخر خدا نے اپنی کتاب صرف اس لیے تو نہیں بھیجی کہ ہم اُسے جزدانوں میں سجا کر رکھیں یا اس سے دَم درُود کا کام لیں اور ایصالِ ثواب کریں بلکہ اصلاً یہ کتابِ ہدایت ہے، زندگی گزارنے کا لائحہ عمل ہے ــــ اور یہ اسلامی حمیت والی بات اتنی بے وزن بھی نہیں کیوں کہ اس سے پہلے یہ روایت قائم ہو چکی ہے کہ پاکستان کے ایک غیر مسلم چیف جسٹس ایک مغربی مُلک میں دُنیا بھر کے ماہرینِ قانون کی ایک کانفرنس میں اسلامی حدود کے نفاذ کی حمایت کر چکے ہیں، لیکن ہم کہتے ہیں کہ چلئے اس بات کو میرٹ کی بنیاد پر لیں، ہم دیکھتے ہیں کہ دُنیا کے بہت سے ممالک میں خصوصاً سوشلسٹ بلاک میں سخت ترین سزائیں نافذ ہیں، لیکن یہ اقوام اپنے قوانین پر عمل کرتے ہوئے خجالت محسوس نہیں کرتیں اور نہ انہیں جابرانہ قرار دے کر منسوخ کرنے کا مطالبہ کرتی ہیں۔ پھر ہمیں ہی اپنے حدود قوانین پر شرم کیوں آئے؟

اب آیئے میرٹ کی ایک اور بنیاد کی طرف۔ دنیا میں اس وقت جرائم کی شرح جس ملک میں سب سے کم ہے وہ سعودی عرب ہے جہاں حدُود نافذ ہیں اور دُنیا میں جرائم کی شرح سب سے زیادہ امریکہ اور یورپ میں ہے۔ جو ہمارے ہاں مغرب سے متاثر ذہنوں کا قبلہ و کعبہ ہے۔ دراصل جو بات ہمارے بعض دانشوروں کے پلّے نہیں پڑتی۔ وہ یہ ہے کہ مغرب کا وہ بنیادی فلسفہ ہی غلط ہے جو یہ کہتا ہے کہ اس فرد (یعنی مجرم) سے تو نرمی برتو جو ظلم و تجاوز کرتا ہے لیکن اس سوسائٹی سے انصاف نہ کرو جس کے ساتھ ظلم ہوتا ہے۔ اس کے برعکس اسلام

کا فلسفہ یہ ہے کہ پہلے تو ایسا ماحول پیدا کرو جہاں جرم تک کی نوبت ہی نہ پہنچے اور اگر اس کے باوجود کوئی شریر النفس ظلم و تجاوز کرے تو مجرم کو سخت سزا دو تاکہ اسے بھی غلطی کا احساس ہو اور دوسرے بھی عبرت پکڑیں تاکہ انسانی معاشرہ مجرموں کی زرخیز پناہ گاہ نہ بن جائے۔

۳۔ جناب جسٹس صاحب کا ایک موقف یہ ہے کہ مولوی تو اجتہاد کے اہل نہیں، قانون کی پریکٹس تو کرتے ہیں وکلا، اور ان میں سے خاصے ایسے لوگ ہیں جو ذہین و فطین ہیں اور معاشرے کی قانونی ضروریات کو سمجھتے ہیں۔ لہٰذا اجتہاد کا حق انہیں ملنا چاہیے لیکن اس میں دقت یہ سامنے آتی ہے کہ اجتہاد کے لیے قرآن و سنت کے گہرے علم کی ضرورت ہے اور اکثر اسلامی لٹریچر عربی زبان میں ہے۔ وکلا اور جج حضرات کی اکثریت کو عربی آتی نہیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ اسلامی قانون کے مصادر سے براہ راست استفادہ نہیں کر سکتے۔ اس کا حل جسٹس موصوف یہ تجویز فرماتے ہیں کہ اجتہاد کے لیے عربی کی شرط اڑا دی جائے کیونکہ قرآن و سنت اور فقہ کو سمجھنے کا دعویٰ تو اردو انگریزی تراجم سے بھی ہو سکتا ہے۔ لیکن یہ عربی سیکھنا تو ایک لاینحل مسئلہ ہے۔ اجتہاد کے سلسلے میں ملا و مولوی کی کمزوریاں اپنی جگہ (اگرچہ سارے علما انگریزی زبان اور عصری ضروریات سے اتنے بے خبر بھی نہیں بلکہ اب تو ایسے آدمی بھی الحمد للہ ہمارے ہاں موجود ہیں جو جدید قانون اور اسلامی فقہ دونوں پر اچھی نظر رکھتے ہیں، اگرچہ تعداد میں تھوڑے ہی سہی)۔ لیکن اس کا حل جو جسٹس صاحب نے تجویز فرمایا ہے وہ بہت خوب ہے۔ یہ تو بالکل ایسے ہی ہے جیسے یہ مطالبہ کیا جائے کہ جو شخص برٹش کامن لا میں پی ایچ ڈی کرنا چاہے اس پر سے یہ شرط ختم کر دی جائے کہ اسے انگریزی زبان بھی آتی ہو۔ یا یہ مطالبہ کیا جائے کہ ڈاکٹروں پر سے یہ پابندی اٹھا لی جائے کہ وہ ایم بی بی ایس بھی پاس ہوں۔ یا بدرجہ آخر یہ مطالبہ ہو کہ ایک آدمی کو علاج کروانے کے لیے ایک انجینئر کے پاس جانے اور اپنا مکان بنوانے کے لیے ڈاکٹر کے پاس جانے کی اجازت ہونی چاہیے۔

جو بات ہمارے قابلِ احترام جج صاحب اور ان کے ہم خیال اصحاب کے سمجھنے کی ہے وہ یہ ہے کہ اجتہاد کا حق کسی خاص طبقے یا نسل یا جنس میں محصور نہیں ہے بلکہ اجتہاد کا حق

ہر اس مسلمان کو حاصل ہے جو صاحبِ علم ہو اور اس علم کے حصول پر کوئی پہرہ تو نہیں، کوئی پابندی تو نہیں جو بھی چاہے اپنی محنت و کوشش سے یہ وصف حاصل کر سکتا ہے۔ لہٰذا بجائے اس کے کہ ملّا کو بُرا بھلا کہا جائے یا وکلا و جج صاحبان کو حق اجتہاد دلوانے کے لیے عربی کی شرط ختم کرنے کی تجویز رکھی جاتی۔ یہ بات زیادہ منطقی اور قابلِ فہم ہے کہ وکلا پر عربی اور فقہ اسلامی پڑھنے کی شرط عاید کر دی جائے۔ جسٹس صاحب حکومتی اور قانونی حلقوں میں بارسوخ ہیں۔ اگر وہ متعلقہ اعلیٰ حلقوں کو قانون کے طالب علموں اور پریکٹس کرنے والے وکلا اور ججوں کے لیے عربی زبان اور اسلامی فقہ کی تدریس و تربیت کی اہمیت کا احساس دلوا سکیں تو یہ ایک بہت بڑا کار خیر ہوگا اور اس اعلیٰ و ارفع نسبت سے مناسبت بھی رکھے گا جس کے وہ حامل ہیں۔

اس بات پر بھی غور و فکر ضروری ہے کہ جسٹس صاحب اور بنچ اور بار میں ان کے دوسرے ساتھیوں کے ایسے ہی خیالات کا پس منظر کیا ہے؟ ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ ایک آدمی نے اپنی عمر کا بہترین وقت اور کثیر سرمایہ لگا کر ایک علم حاصل کیا، اس کی پریکٹس کی، پھر محنت و کوشش کے بعد اس میں ایک اعلیٰ مقام حاصل کیا۔ اب اچانک ماحول میں ایک تبدیلی آتی ہے اور ایک آدمی اُٹھ کر کہتا ہے کہ یہ وکلا اور جج حضرات تو عربی اور اسلامی فقہ میں ماہر نہیں لہٰذا یہ اس کام کے اہل نہیں۔ دوسری طرف عربی اور اسلامی فقہ کی شدھ بُدھ عموماً ان لوگوں کو ہے جو ملّا اور مولوی ہیں۔ اور جن کا معاشرے میں کوئی اُونچا مقام نہیں۔ اِن حالات میں ردِ عمل کا ہونا ایک فطری بات ہے، یہ ہزاروں پڑھے لکھے معزز لوگوں کے کیریئر اور روزگار کا مسئلہ ہے۔ اسی لیے انفرادی مخالفت کے علاوہ بعض وکلا تنظیموں نے قاضی عدالتوں کے خلاف باقاعدہ قرار دادیں پاس کی ہیں اور اب حکومتی اور غیر حکومتی حلقوں میں اسی تاثر کے تحت بعض دینی سیاسی جماعتوں کے پیش کردہ شریعت بل کی مخالفت بھی جاری ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ اگر تدبر اور تحمل سے کام لیا جائے تو اس مسئلے کو ہزاروں معزز لوگوں کے کیریئر اور روزگار کا مسئلہ بنائے بغیر بھی حل کیا جا سکتا ہے۔ ملک کا عدالتی ڈھانچہ آخر بٹن دبانے سے تو اسلامی نہیں ہو جائے گا۔ اور نہ اس کے لیے ضروری تیاری کیے بغیر

کوئی دیرپا اور مفید کام کیا جا سکتا ہے - لہٰذا موجودہ ماہرینِ قانون کی ضرورت ہمیں کافی عرصے تک رہے گی - ہم سمجھتے ہیں کہ بنچ اور بار میں ہمارے قابلِ احترام بھائیوں کو اتنا گھبرانے کی ضرورت نہیں کیونکہ بظاہر ایسے امکانات نظر نہیں آتے کہ مستقبل قریب میں پاکستان میں ایسی حکومت قائم ہو جائے گی جو پوری توجہ اور اخلاص کے ساتھ ملک کے ڈھانچے کو اسلامی تعلیمات کے مطابق ڈھالنے میں زور دکھائے گی تاہم اگر ایسی صورت ہو تو بھی ہم پیشۂ قانون سے وابستہ ان معزز حضرات کی خدمت میں یہ گذارش کرنا ضروری سمجھیں گے کہ حقیقی اسلامی عدل کے نفاذ میں انہیں کوئی قربانی دینی بھی پڑے تو اچھا مسلمان ہونے کا ثبوت دیتے ہوئے انہیں قربانی سے گریز نہیں کرنا چاہئے کیونکہ احکامِ الٰہی کے مطابق فیصلے نہ ہونا اور نہ کرنا کوئی معمولی بات نہیں، اللہ تعالیٰ نے قرآنِ حکیم میں صاف صاف فرمایا ہے کہ "جو لوگ میرے احکام کے مطابق فیصلے نہ کریں وہ ظالم ہیں..... وہ فاسق ہیں..... وہ کافر ہیں" صاحبِ ایمان ہی نہیں اور صاف ظاہر ہے کہ مسلمان خواہ کتنا ہی گیا گزرا ہو (خواہ جج اور وکیل ہی کیوں نہ ہو) ایمان کی قیمت پر بہر حال کوئی مفاد حاصل نہیں کر سکتا -

ایک اور اہم بات جس کا ادراک حاملینِ فکرِ اقبال کو کرنا چاہیے - وہ یہ ہے کہ اقبال ایک غلام ملک کا فرد تھا - وہ اسلام کے غلبہ کی آرزو ہی کر سکتا تھا اور وہ اس نے کی بلکہ اس کی عظمت یہ ہے کہ اس نے یہ آرزو دوسروں میں بھی پیدا کی لیکن چونکہ اسلام کے عملی نفاذ کے لیے کوئی حقیقی پلیٹ فارم اس کے سامنے موجود نہ تھا، اس لیے اس کی آرزو کا رومانوی ہونا بالکل سمجھ میں آتا ہے، عملی زندگی کی مشکلات کسی فکر و فلسفے کے رومانوی تصور سے الگ چیز ہوتی ہے مثلاً: اقبال انتخابات کا حامی تھا، ہم بھی اس کے حامی ہیں لیکن کیا پاکستان میں مروجہ انتخابات کے عمل سے حقیقی رائے عامہ کے حامل نمائندہ لوگ اوپر آ سکے ہیں؟ اس کا جواب ہاں میں دینا مشکل ہے، اقبال منتخب اور بالاتر پارلیمنٹ کا حامی تھا اور اسے حقِ اجتہاد دینا چاہتا تھا، ہم بھی اس کے حامی ہیں - لیکن کیا ہماری پارلیمنٹ کے ارکان قرآن و سنت کی تفسیر و تشریح اور اجتہاد کے اہل ہیں؟ ظاہر ہے

(باقی برصفحہ ۲۹)

حضرت یونسؑ اور واقعۂ حُوت

تحقیق از جناب سید شبیر محمد - گلبرگ لاہور

بلاشبہ ترقی کے اس دور میں ہر شخص اس حقیقت کا اقرار کرے گا کہ آئے دن دنیا کے کسی نہ کسی حصے میں اللہ تبارک و تعالیٰ کی قدرتِ کاملہ سے محیر العقول اوامر و عوامل کے تابع ایسے ایسے واقعات و عجائبات ظہور پذیر ہوتے رہتے ہیں جو اسے ورطۂ حیرت میں ڈال دیتے ہیں۔ کبھی کسی ہوائی حادثہ کی خبر شائع ہوتی ہے کہ اس میں سوار سب مسافر لقمۂ اجل بن گئے ہیں سوائے ایک ناتواں شیر خوار بچے کے جو معجزانہ طور پر زندہ بچ رہا - اسی طرح شُلیوان (SULLIVAN) نامی کی ریاست ورجینیا کا ایک شخص سات دفعہ آسمانی بجلی گرنے کے بعد بھی زندہ بچتا رہا، گو پہلی چھ مرتبہ اسے معمولی معمولی گزند پہنچتا رہا۔ لیکن ساتویں مرتبہ اس کا پیٹ اور چھاتی بُری طرح جل گئے - اور اسے ہسپتال میں داخل ہو کر علاج کروانا پڑا، جس کے بعد وہ تندرست ہو گیا۔

اسی طرح ایک بہت عظیم معجزے کے ذریعے اللہ تبارک و تعالیٰ نے حضرت یونسؑ کو جسے وصیل نے نگل لیا تھا، زندہ و سلامت بچا لیا تھا - اس معجزے کا قصہ ہم تفصیلاً یہاں بیان کرتے ہیں۔

حضرت یونسؑ اور حوت کا ذکر قرآنِ پاک کی سورۃ الصافات اور سورۃ القلم میں آیا ہے - اوّل الذکر کی آیات نمبر ۱۴۲، ۱۴۳، ۱۴۴ میں وارد ہے کہ حوت نے حضرت یونسؑ کو نگل لیا

اور وہ ملامت زدہ تھا۔ اگر وہ تسبیح کرنے والوں میں سے نہ ہوتا تو روزِ قیامت تک اس (حوت) کے پیٹ میں رہتا۔ آخر کار ہم نے اسے بڑی سقیم حالت میں چٹیل زمین پر پھینک دیا۔ اور اس پر ایک بیل دار درخت اُگا دیا۔ سورہ القلم کی آیات نمبر ۴۸، ۴۹ میں یوں مذکور ہے۔ "پس اپنے رب کا فیصلہ صادر ہونے تک صبر کرو۔ اور حوت والے (حضرت یونسؑ) کی طرح نہ ہو جاؤ۔ جب اس نے پکارا تھا اور وہ غم سے بھرا ہوا تھا۔ اگر اس کے رب کی مہربانی شاملِ حال نہ ہوتی تو وہ مذموم ہو کر چٹیل میدان میں پھینک دیا جاتا۔"

سورہ الانبیاء کی آیات نمبر ۸۷، ۸۸ میں حضرت یونسؑ کا ذکر بطور ذوالنون ہوا ہے۔ مذکورہ آیات میں حضرت یونسؑ کی مشہور دُعا لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحٰنَكَ اِنِّيْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ مذکور ہے۔ اللہ پاک نے فرمایا "کہ جب حضرت یونسؑ نے (نون کے پیٹ کی) تاریکیوں میں یہ دُعا مانگی تو ہم نے اس کی دُعا قبول کر لی اور غم سے اس کو نجات بخشی"۔ گویا یہ ایک نادر الوقوع معجزہ تھا جو مشیتِ ایزدی سے حضرت یونسؑ کو پیش آیا۔

چند حضرات نے جو معجزات کے قائل نہیں ہیں، اس واقعہ کی متعلقہ آیات کے ترجمے اور تفسیر میں بلاوجہ تعبیریں کی ہیں۔ ان میں سر سید احمد خان، مولوی محمد علی لاہوری اور غلام احمد پرویز شامل ہیں۔ ان کے علاوہ مشہور ترک رہنما خالدہ ادیب خانم نے اپنی کتاب "اندرونِ ہند" کے صفحہ ۱۰۱ پر لکھا ہے کہ مغرب زدہ موجودہ نسل کے ایک ترک نوجوان طالب علم نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ "میں اپنے آپ کو مسلمان نہیں کہہ سکتا کیونکہ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ یونس مچھلی کے پیٹ میں کیونکر زندہ رہے"۔ ہمارے نزدیک ایسے لوگوں کا یہ رویہ درست نہیں اور یہ محض ان کی لاعلمی اور کم فہمی پر مبنی ہے۔

یہاں حوت اور نون ہم معنی الفاظ ہیں، اور صاحب الحوت اور ذوالنون حضرت یونسؑ کے القاب ہیں۔ حوت اور نون سے مراد ایک کوہ پیکر آبی جانور ہے۔ مادہ حوت بچہ جنتی ہے اور مچھلی کی طرح انڈے نہیں دیتی جن سے بچے نکلیں۔ علاوہ بریں حوت اپنے نوزائیدہ بچے کو دودھ پلاتی ہے۔ جو بہت گاڑھا اور مقوی ہوتا ہے۔ حوت پھیپھڑوں کے ذریعے سانس

لیتی ہے۔ اس دیو قامت آبی جانور کو مچھلی کہنا غلط ہے۔ ہمارے قدما نے اسے دابہ کے نام سے تعبیر کیا ہے۔ انگریزی میں اسے (MAMMAL) کہتے ہیں۔

ہماری سائنسی تحقیقات کے مطابق حضرت یونسؑ اور حوت کا معجزہ نادر الوقوع اور محیر العقول ضرور ہے لیکن ناممکن الوقوع ہرگز نہیں۔ یہ مسلمہ امر ہے کہ معجزہ ہوتا ہی محیر العقول ہے۔ جس سے انسانی عقل عاجز آجاتی ہے۔

بلاشبہ اللہ تبارک و تعالیٰ جو قادر مطلق ہے ایسے حالات کا اجتماع رونما کر سکتا ہے جن میں یہ معجزہ واقع ہوا۔ ہماری تحقیقات کی رُو سے مذکورہ حوت ایک قسم کی وھیل تھی، جسے (SPERM WHALE) کہتے ہیں۔ اس کو غزوہ سیف البحر سے متعلقہ احادیث میں عنبر کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔ کیونکہ اس کی انتڑیوں سے مشہور زمانہ خوشبو نکلتی ہے جسے —— (AMBERGRIS) یعنی عنبر کہا جاتا ہے۔

ذیل میں ہم اس آبی جانور کی قامت و جسامت، اوصاف و خصائل اور مخصوص عادات میں سے چند ایک کا ذکر کرتے ہیں تاکہ اس معجزے کے وقوع کے سمجھنے میں آسانی ہو۔ یہ سب اوصاف و خصائص کسی اور قسم کی وھیل یا مچھلی مثلاً شارک وغیرہ میں بیک وقت نہیں پائے جاتے۔ اس لیے ان میں سے کسی ایک کا بھی اس معجزے سے کوئی تعلق نہیں ہو سکتا۔

الف —— جسامت کے لحاظ سے وھیل کی ایک قسم جسے نیلی وھیل یعنی BLUE WHALE کہتے ہیں، سب وھیلوں سے بڑی ہوتی ہے۔ اس کی لمبائی سو، سوا سو، فٹ تک ہوتی ہے۔ اور وزن ۵۰ ٹن تک ہوتا ہے۔ عنبر کی اوسط لمبائی ۶۰، ۷۰ فٹ ہوتی ہے۔ اور اس کا وزن ۹۰ ٹن تک دیکھنے میں آیا ہے۔ نیلی وھیل کے مقابلے میں عنبر کی جسامت اور وزن کم ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر بیل (BEALE) اور ڈاکٹر بینٹ (BENNET) نے ایک عنبر کی لمبائی ۸۴ فٹ لکھی ہے۔ اس کا زیادہ سے زیادہ محیط ڈاکٹر بیل کے اندازے کے مطابق ۳۶ فٹ اور زمین پر لٹانے کے بعد اس کی زیادہ سے زیادہ لمبائی ۱۲ سے ۱۴ فٹ ہوتی ہے۔ عنبر وھیل کے مشہور شکاری بلن (BULLEN) نے اپنی مشہور کتاب (CRUISE OF THE CACHALOT) میں لکھا ہے کہ ایک عنبر کی لمبائی جو اس کے مشاہدے میں آئی ۷۰ فٹ تھی۔ یہ امر ملحوظ خاطر رہے کہ پیدائش کے

وقت عنبر کے بچے کی لمبائی ۱۳، ۱۴ فٹ اور وزن ایک ٹن سے کچھ زائد ہوتا ہے۔ اور یہ تقریباً ایک ٹن دودھ روزانہ پیتا ہے۔ اور دو سال کی عمر میں اس کی لمبائی ۲۴ فٹ تک ہو جاتی ہے اور وزن ۴ ٹن تک پہنچ جاتا ہے۔ ڈاکٹر شیفر (VICTOR SCHEFFER) کے بیان کے مطابق عنبر کی روزمرہ کی خوراک اس کے کل وزن کے ۳ فیصد کے برابر ہوتی ہے اور یہ عام جانداروں کی طرح پانی نہیں پیتی۔

ب — عنبر وصیل کا جبڑا بہت لمبا ہوتا ہے۔ ملن نے ایک عنبر کا نچلا جبڑا ناپا تو وہ ۱۹ فٹ تھا۔ عام اندازے کے مطابق اس کے سر کی لمبائی اس کے جسم کی کل لمبائی کے ۱/۳ کے برابر ہوتی ہے۔ گو انسائیکلوپیڈیا برٹینیکا کی جلد ۱۹ مطبوعہ ۱۹۸۱ء کے صفحہ ۸۰۰ پر مندرج بیان کے مطابق ۱/۴ تک بھی ہو سکتی ہے۔ اس کے اوپر کے جبڑے میں دانت نظر نہیں آتے، البتہ نچلے جبڑے میں بلوغت کے قریب فاصلے فاصلے پر دانت نکل آتے ہیں جن سے یہ اپنی خوراک کو چبانے کا کام نہیں لے سکتی۔ البتہ اس کے بڑے بڑے ٹکڑے کر سکتی ہے۔ یہ اپنی خوراک کو جو بالعموم (SQUID) پر مشتمل ہوتی ہے، سالم نگل لیتی ہے۔

ج — اس کا حلق بہت فراخ اور وسیع ہوتا ہے، جس سے یہ ایک لحیم وشحیم انسان کو بآسانی نگل سکتی ہے اور بعد میں خاص حالات میں اسے اُگل کر باہر پھینک سکتی ہے۔ اس کے حلق کے نیچے کئی جھریاں (FOLDS) بھی ہوتی ہیں۔ اور جب اسے معمول سے زیادہ بڑی چیز نگلنا پڑ جائے تو اس کا حلق جھریوں کے کھل جانے سے وسیع تر ہو سکتا ہے اور وہ ایک عام انسان کی جسامت سے بڑی اشیاء کو بھی بآسانی نگل سکتی ہے۔

د — اس کے پیٹ کے بالعموم چار بڑے حصے ہوتے ہیں۔ تازہ شکار یا تو اس کے حلق میں اُتر جاتا ہے یا کچھ دیر بعد اس کے پیٹ کے پہلے حصے میں چلا جاتا ہے۔ اس کا عملِ انہضام بالعموم بعد میں اس کے پیٹ کے دوسرے اور تیسرے حصے میں ہوتا ہے۔

ر — اکثر اوقات یہ آبی کوہ پیکر جانور دریاؤں یا سمندروں کے ساحلوں پر موجوں کے جزر کے وقت یا اس کے بعد آوارہ، واماندہ یا وارفتہ حالت میں (STRANDED) بھی پایا جاتا ہے۔ اس وقت اس پر ایسی سراسیمگی اور وحشت طاری ہو جاتی ہے کہ یہ واپس دریا یا سمندر

میں نہیں لوٹ سکتا ۔ اس وقت اس کی جان کنی شروع ہو جاتی ہے ۔ اور اپنے ہی بوجھ کے تلے اس کا سینہ دب کر پچک جاتا ہے اور اس کے پھیپھڑے جواب دے جاتے ہیں ۔ اکثر اوقات عنبر وھیل کے غول اس طرح کسمپرسی کی حالت میں بعض ساحلوں پر دیکھنے میں آئے ہیں ۔ اگرچہ کبھی کبھی اکّے دُکّے عنبر وھیل بھی ساحلوں پر مُردہ حالت میں پائے گئے ہیں ۔ برزن (BERZIN) نامی ایک روسی ماہر نے ایک معتبر معلوماتی کتاب عنبر وھیلوں پر لکھی ہے ۔ اس میں اس نے لکھا ہے "کہ کئی دفعہ بڑے بڑے سمندروں کے ساحلوں کے علاوہ ، بحیرۂ روم ، عرب امارات ، خلیج ایران ، بحیرہ قلزم اور اردگرد کے علاقائی ساحلوں پر بھی ایسے عبرت ناک مناظر دیکھنے میں آئے ہیں ۔

س ـــــ ماہرین کا اس بات پر اتفاق ہے کہ عنبر وھیل جب قریب مرگ ہوتی ہے یا شکاری کے وار سے قریب المرگ ہو جاتی ہے یا کسی اور وجہ سے وحشت اور سراسیمگی میں مبتلا ہو جاتی ہے تو اکثر خوراک وغیرہ کو جو اس نے کچھ دیر پہلے نگلی ہو اپنے حلق (GULLET) یا پیٹ کے پہلے حصّے سے باہر اگل پھینکتی ہے ۔ بلن نے لکھا ہے کہ " ایک دفعہ اس نے سمندر کی سطح پر ایک ضخیم شے تیرتی ہوئی دیکھی جو بہت صاف اور شفاف تھی ، جس کی ضخامت ۲×۶×۸ نکلی ۔ مزید تحقیقات پر اسے معلوم ہوا کہ یہ CUTTLE FISH یا SQUID کا ایک ٹکڑا تھا جسے ایک SPERM WHALE نے ہڑپ کر لیا تھا اور بعد میں موت سے پہلے اس نے اُسے باہر اُگل پھینکا تھا ۔ ۱۹۵۵ء میں کلارک CLARKE نامی ایک برطانوی ماہر نے ایک ۴۷ فٹ لمبے سانڈ کا پیٹ چاک کیا تو اس میں سے ایک سالم SQUID برآمد ہوا جس کی لمبائی ۳۴٫۵ فٹ تھی اور اس کا وزن ۴۰۰ پونڈ تھا ۔ اسی ماہر نے ۱۹۵۶ء میں ایک اور عنبر کے پیٹ میں سے ایک ۸٫۲ فٹ لمبی شارک نکالی ۔ نارمن اور فریزر نامی دو برطانوی ماہرین نے ایک عنبر وھیل کا پیٹ چاک کیا تو اس میں سے ایک ۱۰ فٹ لمبی شارک برآمد ہوئی ۔ ایک امریکی مصنف رچرڈ ایلس (RICHARD ELLIS) نے بھی کئی ایسے واقعات کا ذکر اپنی کتاب (THE BOOK OF WHALES) میں کیا ہے ۔ اس نے اس کتاب کے صفحہ ۱۰۴ پر جاپانی ماہرین اوکوٹانی اور نموٹو (OKOTAN & NEMOTO) کے حوالے سے لکھا ہے کہ عنبر وھیل کے پیٹ میں سے جو جو SQUID ان کے مشاہدے میں آئے وہ بھی بالکل صحیح وسالم تھے

اور ان کے جسموں پر وھیل کے دانتوں وغیرہ کے کوئی نشان یا زخم نہ تھے۔ ایلس نے لکھا ہے کہ ایک دفعہ ایک قریب المرگ عنبر نے کئی بھری ہوئی بالٹیوں کے برابر بارہ بارہ تازہ کھائے ہوئے (SQUID) بذریعہ قے باہر اگل پھینکے۔

ص ـــــ عنبر وھیل کی ایک مخصوص پیدائشی عادت جس کا ذکر ڈاکٹر بیلی DEALE اور پروفیسر سلجپر (SLIJPER) نے کیا ہے وہ یہ ہے کہ پانی میں تیرتے وقت عنبر وھیل اپنے نچلے جبڑے کو نیچے لٹکا لیتی ہے۔ اور اس طرح اس کے تالو اور جبڑے کی پرکشش رنگت ظاہر ہو جاتی ہے۔ اس رنگت کا ایک مسمریزمی اثر ہوتا ہے جس سے مسحور ہو کر بنا شکار مثلاً مچھلی یا (SQUID) خود بخود اس کے حلق میں کھنچے چلے آتے ہیں۔ جو ماہرین اس جادو اثری کے قائل نہیں وہ بھی یہ تسلیم کرتے ہیں کہ عنبر پانی میں تیرتے وقت اپنا منہ کھلا رکھتی ہے اور جو چیز بھی اس کے منہ کے سامنے آتی ہے وہ خود بخود اس کے حلق میں اتر جاتی ہے۔ عام طور پر (SQUID) اس کی خوراک کا اہم جزو ہے۔ گویہ ہر قسم کی مچھلیاں اور دوسرے آبی جانور بھی کھا جاتی ہے۔ بعض ماہرین نے لکھا ہے کہ کئی عنبر وھیلیں اندھی ہو جاتی ہیں یا باہمی لڑائی یا حادثات میں ان کے نچلے جبڑے ٹوٹ جاتے ہیں یا مڑ جاتے ہیں، لیکن پھر بھی وہ اپنی دوسری تندرست ساتھی عنبر وھیلوں کے مقابلے میں لاغر یا کمزور تر نہیں پائی گئیں، کیونکہ حسبِ عادت منہ کھول کر تیرتے وقت ان کی خوراک وافر اور کافی مقدار میں ان کے حلق میں اتر جاتی ہے۔

ط ـــ عنبر وھیل ایک سیلانی آبی جانور ہے جو غولوں کی صورت میں محوِ سفر رہتا ہے اور دنیا کے اکثر سمندروں، دریاؤں، خلیجوں، کھاڑیوں اور بڑی بڑی جھیلوں میں پایا جاتا ہے۔ اس کا مخصوص عملِ تنفس اور اس کا متعلقہ نظامِ تشریح بھی قابلِ غور ہے۔ اس کے تنفس میں حیرت انگیز باقاعدگی پائی جاتی ہے۔ عنبر وھیل بڑی باقاعدگی کے ساتھ غوطے لگاتی ہے بعض دفعہ تو عنبر وھیل ۳۷۲۰ فٹ کی گہرائی تک یا اس سے بھی زیادہ گہرائی تک غوطہ لگاتی پائی گئی ہے۔ ایک دفعہ تو غوطہ ۸۲ منٹ تک جاری رہا۔ لطف کی بات یہ ہے کہ سطحِ آب سے نیچے تیرتے وقت یا غوطے کے دوران یا منہ کھول کر شکار کے وقت اس کے حلق یا پیٹ یا پھیپھڑوں میں پانی داخل نہیں ہو سکتا۔ برزن نے اپنی کتاب کے صفحات ۱۱۱، ۱۱۵ اور ۱۱۶ پر اس امر کی

وضاحت کی ہے۔ اور ماہرین کے علاوہ ڈاکٹر بیل نے بھی اس خصوصیت پر روشنی ڈالی ہے۔

عام مشاہدوں میں آیا ہے کہ اگر عنبر وھیل ایک منٹ تک پانی میں غوطہ لگاتی ہے تو ایک دفعہ سطح آب پر نمودار ہو کر مخصوص طور سے سانس باہر نکالتی ہے جو ایک مرطوب بھاپ کی صورت میں بلند ہوتا ہے۔ علاوہ بریں بعض اوقات سطح آب سے اوپر بہت بلند چھلانگ بھی لگاتی ہے۔

ع — غزوۂ سیف البحر کے سلسلے میں عنبر وھیل کا ذکر ہم اشارۃً گذشتہ پیرا نمبر ۴ کے آغاز میں کر چکے ہیں۔ اس کی کچھ تفاصیل دلچسپ ہیں جن کا یہاں ذکر کرنا ہم مناسب سمجھتے ہیں۔ اس کی عظیم جسامت کے پیشِ نظر اسے ایک بہت بڑے ٹیلے سے تشبیہ دی گئی ہے۔ یہ اس قدر عظیم الجثہ تھی کہ تین سو غازیوں نے جن کا راشن ختم ہو چکا تھا اور بھوک کے مارے بے اور درختوں کے پتے کھاتے رہے۔ انہوں نے اٹھارہ دن اور بعض روایتوں کے مطابق تیس دن تک اس کا گوشت پیٹ بھر کر کھایا اور اس کی چربی (BUTTER) سے اپنے نحیف و نزار جسموں پر مالش کرتے رہے۔ یہاں تک کہ وہ تندرست و توانا ہو گئے۔ اس کا کچھ گوشت جو اُن سے بچ رہا وہ واپسی پر مدینہ منورہ لے گئے۔ جسے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی کھایا۔ اس عنبر کی جسامت کا مزید اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ حضرت ابو عبیدہؓ نے جو اس لشکر کے سالار تھے اس کی پسلی کی ہڈیوں کو زمین میں گڑوا کر ایک طویل القامت غازی کو ایک اونچے اونٹ پر سوار کرا کر اس کے نیچے سے گزرنے کا حکم دیا تو وہ بآسانی گزر گیا۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آیا انسان کو ایسا حادثہ پیش آ سکتا ہے جیسا کہ حضرت یونس علیہ السلام کو پیش آیا تھا۔ ہمارے مطالعے میں ایک ایسے حادثے کا ذکر آیا ہے۔ فرانس کے رسالہ (JOUMAL DES DEBATS) مجریہ ۴ مارچ ۱۸۹۸ء میں عنبر وھیل کے ایک شکاری جیمز بارٹلے (JAMES BARTLEY) کا واقعہ شائع ہوا تھا، جو عنبر کے شکار کرنے والے (STAR OF THE EAST) نامی جہاز پر ملازم تھا۔ جنوبی امریکہ کے ملک ارجنٹائن کے نزدیک فاک لینڈ کے جزیرے کے قریب اس جہاز کے عملے کو ایک عنبر وھیل دکھائی دی جسے شکار کرنے کے لیے ایک کشتی سمندر میں اتاری گئی جسے بارٹلے چپوؤں کے ذریعے سے چلا رہا تھا۔ دوران شکار وھیل سے شدید مقابلہ ہوا تو وھیل کی ٹکر سے کشتی دو ٹکڑے ہو گئی

اور بارٹلے سمندر میں گر کر وھیل کے حلق میں چلا گیا۔ کوئی دو گھنٹے بعد یہ وھیل مار دی گئی۔ اگلے روز علی الصبح جب وھیل کا پیٹ چاک کیا گیا تو اس میں سے بارٹلے بے ہوشی کے عالم میں زندہ پایا گیا۔ اس کے ساتھیوں نے نکال کر اسے فوری طبی امداد بہم پہنچائی۔ چنانچہ مناسب علاج معالجے اور دیکھ بھال اور آرام کے بعد بارٹلے تندرست ہو گیا۔ گو وھیل کے اندر کی تیزابی رطوبت سے اس کی جلد متاثر ہوئی جو اپنا اصلی رنگ کھو بیٹھی۔ بارٹلے کا جو قصہ فروری ۱۹۶۴ء کے اُردو ڈائجسٹ میں شائع ہوا تھا، اس میں کئی اغلاط تھیں۔ بعض سائنس دانوں نے البتہ اس قصے کی اصلیت سے انکار کیا ہے۔ لیکن اس کے لیے کوئی معقول وجہ بیان نہیں کی۔ ۱۹۲۷ء میں آکسفورڈ یونیورسٹی کے ایک پروفیسر ولسن نے پرنسٹن تھیولوجیکل ریویو کی جلد نمبر ۲۵ میں ایک آرٹیکل لکھا تھا جس کا عنوان THE SIGN OF THE PROPHET JONAH AND ITS MODERN CONFIRMATION تھا۔ اس میں انہوں نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ بارٹلے کا قصہ صحیح ہے۔ اور سائنس کے نقطۂ نظر سے اس کے صحیح تسلیم کرنے میں کوئی رکاوٹ نہیں ہونی چاہیے۔ انہوں نے اسی قسم کے ایک اور حادثے کا بھی ذکر کیا تھا۔ لیکن اس کے باوجود بائبل کے موجودہ مفسرین نے سائنس دانوں کی شدید نکتہ چینی کے پیش نظر یونسؑ اور "بڑی مچھلی" کے قصے کو ایک تمثیل کہا ہے۔

ہم پورے یقین سے کہتے ہیں کہ حضرت یونسؑ کو بھی ایسا ہی واقعہ پیش آیا تھا۔ جب وہ نینوا سے بھاگ کر کشتی میں سوار ہوئے تو دریا میں یکایک طوفان اُٹھا۔ کشتی والوں نے قرعہ ڈالنے کے بعد حضرت یونس کو دریا میں اُٹھا پھینکا۔ وہاں اتفاق سے ایک عنبر وھیل حسب معمول منہ کھولے دریا میں تیر رہی تھی۔ اس نے حضرت یونسؑ کو ہڑپ کر لیا۔ پھر آناً فاناً طوفان ٹل گیا۔ جب حضرت یونسؑ عنبر کے پیٹ میں تھے تو انہوں نے نہایت خشوع و خضوع کے ساتھ استغفار کیا اور وہ مشہور دعا مانگی جس کا ذکر ہم اوپر پہلے پیرے میں کر آئے ہیں۔ ربّ العزت نے ان کی دعا قبول کر لی۔ طوفان ختم ہونے کے بعد چونکہ جزر آ گیا اس لیے عنبر وھیل ساحلِ دریا پر پڑی رہ گئی اور قریب المرگ ہو گئی۔ پھر حسب معمول اس نے انہیں ریتیلے ساحل پر آ گل پھینکا۔ لیکن خدائے عزوجل نے جو قادرِ مطلق ہے انہیں زندہ سلامت بچا لیا۔ گویا

کے پیٹ یا حلق میں رہنے کی وجہ سے اس کے اندر کی تیزابی رطوبتوں سے ان کی جلد متاثر ہوئی لیکن شافیٔ مطلق نے انہیں شفا بخشی۔

حضرت یونسؑ کتنی دیر عنبر وھیل کے پیٹ میں رہے۔ اس کے متعلق علماء میں اختلاف رائے ہے۔ بغوی نے بحوالہ مقاتل بن حیان لکھا ہے کہ تین دن رہے۔ عطاء نے سات روز کہا ہے۔ ضحاک نے کہا بیس روز۔ سدی کلبی اور مقاتل بن سلیمان نے کہا ہے کہ چالیس روز رہے لیکن ہمیں ان آراء کے قبول کرنے میں تردد ہے۔ کیونکہ عنبر وھیل کے حلق یا پیٹ کے پہلے حصے میں تو انسان زندہ رہ سکتا ہے اور وہاں سے عنبر وھیل اسے باہر پھینک سکتی ہے۔ لیکن وہاں زیادہ عرصہ اٹکا نہیں رہ سکتا۔ وہاں سے پیٹ کے دوسرے یا تیسرے حصے میں پہنچنا ایک قدرتی عمل ہے۔ اور ان حصص میں عمل انہضام شروع ہو جاتا ہے۔ وہاں اوّل تو زندہ بچ رہنا ناممکنات میں سے ہے اور پھر وہاں سے باہر اُگل پھینکنا بعید از قیاس ہے۔ ہمیں حاکم کی روایت میں حضرت ابن عباسؓ کا قول اور ابو الشیخ کی روایات میں ابو مالک کا قول اور عبد الرزاق اور ابن مردویہ کی روایت میں ابن جریج کا قول اور عبد بن حمید و ابن المنذر کی روایت میں عکرمہ کے قول سے اتفاق ہے کہ دن کا کچھ حصہ حضرت یونسؑ عنبر وھیل کے پیٹ میں رہے۔ البتہ وقت کا تعین کہ چاشت کے وقت سے شام تک رہے، اس سے ہمیں اتفاق نہیں۔ اس ضمن میں ہم یہ بیان کرنا بھی ضروری سمجھتے ہیں کہ بائیبل کے مطابق حضرت یونسؑ تین دن اور تین رات "بڑی مچھلی" (BIG FISH) کے پیٹ میں رہے۔ یہ درست معلوم نہیں ہوتا۔ چنانچہ ٹی۔ ایچ ہکسلے جیسے مشہور سائنس دان نے اس بیان کو شدید تنقید کا نشانہ بنایا ہے۔ بلکہ بعض نے تو اس کی تضحیک کی ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ اس دور میں بائیبل کے اکثر مفسرین بائیبل کے اس قصے کو ایک تمثیل کہتے ہیں۔ اور اس کی تاریخیت اور واقعیت کے منکر ہیں۔

اپنی سائنسی تحقیقات کی روشنی میں ہم پورے وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ اس معجزے کے وقوع کے تسلیم کرنے میں کوئی عقلی دلیل مانع نہیں ہے۔ اور کوئی صاحب عقل و فہم انسان اس کے قرآنی بیان پر کسی قسم کی حرف گیری نہیں کر سکتا۔ البتہ یہ ذہن نشین رہنا چاہیے کہ قرآن پاک نہ تو

سائنس کی کتاب ہے۔ نہ تاریخ کی۔ نہ افسانوں کا مجموعہ ہے، نہ ناول ہی ہے۔ اس کا مقصدِ وحید تمام انسانوں کو مذہبی تعلیم دینا ہے۔ پرانے قصص بیان کر کے بنی نوع انسان کو خدائے ذوالجلال والاکرام کی قدرتِ کاملہ کا یقین دلانا ہے اور انہیں فلاحِ دارین کی طرف بلانا ہے انتہائی مایوسی کے عالم میں بھی اسی خدائے وحدہٗ لاشریک کی طرف رجوع کرنے سے تقدیریں بھی بدل جاتی ہیں۔ حضرت یونسؑ اور وھیل کے معجزے میں بھی ایسے ہی دل نشین اسباق ملتے ہیں، جو غیر ضروری جزئیات سے پاک ہیں۔ یہ بات خاص طور پر ذہن نشین رہنی چاہیے کہ باوجودیکہ موجودہ دور میں سائنس نے حیرت انگیز ترقی کر لی ہے تاہم عنبر وھیل کے متعلق ابھی تک کماحقہٗ معلومات حاصل نہیں ہو سکیں اور ماہرین اور سائنس دان لگاتار اس حیرت انگیز مخلوق کے متعلق تحصیلِ علم اور مشاہدات میں مصروف ہیں اور سوائے اس کے ہمیں چارہ نہیں کہ رَبِّ زِدْنِی عِلْماً۔

(بقیہ اقبال اور نفاذ شریعت)

اس کا جواب نفی ہی میں ہے۔ اقبال اگر آج زندہ ہوتا اور دیکھتا کہ مسلمان ممالک کی پارلیمنٹوں نے کس طرح اسلامی شریعت کو نظر انداز کر کے مغربی ممالک یا سوشلسٹ ممالک کے قوانین کو اندھی عقیدت سے اپنایا ہے تو وہ یقیناً اس کی فکر کرتا۔ اب اگر ان عملی مشکلات کا حل ڈھونڈنے کی کوئی کوشش کی جائے تو اس کی یہ کہہ کر مخالفت نہیں کی جانی چاہیے کہ اقبال اس کا مخالف تھا۔ اقبال کو اپنی زندگی میں جب بھی دینی امور میں کوئی مشکل پیش آتی تھی تو وہ ممتاز علماء سے رجوع کرنے میں کبھی نہیں ہچکچایا اور اس کی متعدد مثالیں موجود ہیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ اقبال نے جس آرزو کو ابھارا اس کو پورا کرنے کے لیے جدوجہد کی جائے اور اس جدوجہد میں افکارِ اقبال کے شارحین کا رویہ اس سلسلہ میں نفاذ کے لیے کام کرنے والی قوتوں کی تائید اور تعاون پر مبنی ہونا چاہیے نہ کہ ان کی مخالفت پر۔

رُوس میں جنگِ افغانستان کے اثرات

تلخیص و ترجمہ: جناب فیض احمد شہابی صاحب - ادارہ معارف اسلامی منصورہ

افغانستان میں مداخلت کے بعد رُوسی فوجیوں کو جس ہلاکت سے گزرنا پڑا ہے اس پر رُوس کے عوام میں بے چینی کی لہر دوڑ گئی ہے۔ جذبات میں ویسی شدت تو نہیں جو جنگ ویتنام کے خلاف امریکی شہریوں نے دکھائی تھی، لیکن عام روسی اس طویل اور بے مقصد آویزش سے اُکتایا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ قومی، علاقائی اور مذہبی پس منظر میں نفرت کی جو مختلف گہرائیاں موجود ہیں۔ رُوسی حکمران ان سے بخوبی واقف ہیں۔ بات یہاں تک پہنچی ہے کہ بعض قومی ریاستوں نے جنگِ افغانستان کے خلاف مشترکہ اعلامیے تک جاری کیے ہیں۔ اگرچہ سوویت یونین کے بے رحم نظام میں کسی سیاسی تحریک کا اُبھرنا تقریباً ناممکن دکھائی دیتا ہے، لیکن جنگِ افغانستان ایک ایسا سانحہ بن کر ٹوٹی ہے جس پر رُوس کے عوام مشتعل ہیں۔ ماسکو کے دانشور سرجئی خوانسکی کا کہنا ہے:

"یہ جنگ۔ ہماری معیشت پر بوجھ ہے۔ ہمارے بھائی بند اس میں مر رہے ہیں۔ نچلے درجے کے کمزور کسان ہوں یا حکومتی کارپرداز سبھی اس سے نالاں ہیں"۔ خوانسکی کے مطابق "اس جنگ کے خلاف کسی طاقت ور تحریک کا اُٹھنا فی الحال ممکن نہیں۔ امریکہ کے مقابلے میں یہاں جبر و تشدد کا راج ہے۔ ان حالات میں عوام میں سیاسی تحریک برپا کرنے کا شعور اور حوصلہ نہیں پایا جاتا۔ اس کے باوجود سوویت حکومت لوگوں

کے جذبات سے بے خبر بھی نہیں۔"

بالٹک کی جمہوریتیں، یوکرین اور وسطِ ایشیا کے عوام افغانستان میں روس کی مداخلت سے خاص طور پر برہم ہیں۔ یہ برافروختگی اس لحاظ سے بجا ہے کہ یہی ہتھکنڈے استعمال کرکے روس ان ریاستوں پر قبضہ جمانے میں کامیاب ہوا تھا۔ سرجی توانسکی اس بارے میں وضاحت کرتے ہیں: "افغانستان میں فوجی مداخلت کے بعد وہ طبقہ نہایت پریشان ہے جس سے رنگروٹ بھرتی کیے جاتے ہیں۔ بعض ریاستوں میں حکومت کے خلاف کھلی مزاحمت اب معمول بن چکی ہے۔ حکومت اپنے ارادوں سے باز نہیں آتی اور احتجاج کرنے والوں کو بے رحمی سے کچل دیتی ہے۔"

کچھ بھی ہو جنگِ افغانستان روس اور اس کے حواریوں کے لیے دردِ سر بن چکی ہے۔ اس نے وہاں کے عوام کو بیداری دی ہے اور نیا شعور عطا کیا ہے۔ پولینڈ کے رسالے روبوتنگ (شمارہ ۸۲ — ۱۹۸۵ء) نے یوکرین کے ساحلی شہر اوڈیسہ کے بارے میں لکھا: "جنگِ افغانستان سے یہاں کے لوگ اتنے بوکھلا گئے ہیں کہ وہ سمجھتے ہیں کہ اسے جیتنا ممکن نہیں ہے۔ ریڈیو لبرٹی نے بھی ایک سروے کے ذریعے انکشاف کیا ہے کہ روس کے ۳/۴ شہری اس بارے میں حکومتی پالیسی کی مخالفت کرتے ہیں"

۱۹۸۳ء تک سوویت پریس نے یہ بتانے کی زحمت ہی گوارا نہیں کی کہ روس افغانستان میں کن کارروائیوں میں اُلجھا ہوا ہے۔ محاذِ جنگ سے ایک روسی سارجنٹ نے پراودا (۱۰ نومبر ۱۹۸۴ء) کو ایک خط لکھا: "میں اس بات پر حیران ہوں کہ ہماری حکومت جنگِ افغانستان کے بارے میں حقائق بیان کرنے سے کیوں کتراتی ہے۔ حالانکہ روسی شہری اپنی زندگی خطرے میں ڈال کر یہاں اپنا فرض ادا کر رہے ہیں۔"

روس کے جنگی نقصانات پر نظر ڈالنے سے حقیقت واضح ہوتی ہے۔ وزارتِ دفاع کے خفیہ اعداد و شمار کے مطابق صرف ستمبر ۱۹۸۰ء میں ۲۹۴۸ روسی سپاہی ہلاک اور ۱۵۰۰ کے قریب زخمی ہوئے۔ اب سے دو برس پہلے جنگ میں کام آنے والے ایک روسی افسر نے بتایا تھا۔ اس میں ہلاک اور زخمی ہونے والے روسیوں کی تعداد ۲۰۰۰۰ سے ۲۰۰۰۰ تک کے قریب تھی

تھی۔ مجاہدین سے آکر ملنے والے ایک یوکرینی منحرف فوجی نے انکشاف کیا کہ ان کے کامریڈ ہلاک ہونے والوں کی تعداد ایک لاکھ کے لگ بھگ بتاتے ہیں۔ اس کا کہنا تھا کہ اتنے روسی فوجی ہلاک تو نہیں ہوئے البتہ یہ تعداد چالیس پچاس ہزار سے کم نہیں۔ لیتھونیا سے چھپنے والے ایک زیرزمین رسالے اوسرا (شمارہ ۳۰) میں درج تھا۔ "سرکاری ریکارڈ کے مطابق تین برسوں میں روس کے ۳۰ فیصد فوجی جنگ میں ہلاک یا زخمی ہوئے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ تعداد چالیس ہزار سے کم نہیں۔

ستمبر ۱۹۸۵ء میں حکومت کے ایک اعلیٰ نمائندے وی آئی چیناکوف نے سیاسی تعلیم کے ایک ادارے میں تقریر کرتے ہوئے انکشاف کیا کہ جنگِ افغانستان میں ہر سال ۱۵۰۰۰ فوجی اپنی جانیں دیتے ہیں۔ ماسکو کی ایک خاتون سیلز کلرک نے اپنی ایک سہیلی (جو شرمیٹوویا کے ٹرمینل پر کام کرتی ہے) کے حوالے سے بتایا کہ ایک اسپیشل ہوائی جہاز روزانہ کابل سے ایک سو کے قریب تابوت لاتا ہے۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو جنگِ افغانستان میں مرنے والے روسیوں کی تعداد تیس چالیس ہزار سالانہ کے لگ بھگ ہے۔ روسی شہری ان جانی نقصانات پر سیخ پا ہیں۔ مارچ ۱۹۸۱ء میں قازق مسلمان فوجیوں کی لاشیں مناسب تجہیز و تکفین کے بغیر دفنانے پر الما عطا میں زبردست مظاہرے ہوئے تھے۔ حالیہ برسوں میں جب کہ جانی اتلاف کئی گنا بڑھ چکا ہے۔ روسی حکام عوام کے غیظ و غضب کا سامنا کرنے سے کتراتے ہیں اور سینکڑوں لاشیں روس لانے کے بجائے وہیں افغانستان میں ٹھکانے لگا دیتے ہیں۔

ہلاکت کی خبریں دوستوں اور رشتہ داروں پہ بجلی بن کر ٹوٹتی ہیں۔ جولائی ۱۹۸۵ء میں مشرقی جرمنی میں تعینات ایک روسی فوجی کو یہ خبر ملی کہ اس کا بھائی جنگ میں مارا گیا ہے تو وہ اپنا ذہنی توازن کھو بیٹھا۔ بعد میں اس نے گیریزن سے فرار ہونے کی کوشش کی تو اسے گولی مار کر ہلاک کر دیا گیا۔ ۱۹۸۴ء میں خارکوف کے قصبے میں ایک عورت نے خود سوزی کر لی۔ وجہ یہ تھی کہ وہ جنگ میں مرنے والے اپنے بیٹے کی لاش حاصل کرنے میں ناکام رہی تھی۔

روسی نوجوان فوج میں بھرتی ہونے سے ڈرتے ہیں۔ ماسکو کے ایک ڈاکٹر کا کہنا ہے کہ ایسے نوجوان بیماری کا بہانہ بنا لیتے ہیں، خود کو زخمی کر لیتے ہیں اور بعض تو زہر کھا کر خودکشی

کی کوشش کرتے ہیں کیروف گراڈ کے ایک ڈاکٹر کے مطابق "ملٹری رجسٹریشن آفس پر افغانستان نہ بھیجنے کے لیے بھاری رشوتوں کی پیش کش کی جاتی ہے - ایک شخص نے اپنا ذاتی مکان اور کار اس شرط پر دینے کی پیش کش کی کہ اس کے بیٹے کو افغانستان نہ بھیجا جائے"۔ حکومت نے اس سر دردی سے بچنے کا حل ڈھونڈ لیا ہے - اب ایسے یتیم بچے جنگ میں جھونکے جا رہے ہیں جن کا والی وارث کوئی نہیں -

روس میں خفیہ چھپنے والے پرچوں (SAMIZDAT) میں جنگِ افغانستان کے خلاف جذبات کا حقیقی اظہار روزمرہ کی بات ہے، لیکن اب ملک کے طول و عرض میں ایسے غیر قانونی ٹیپ شدہ المیہ گیت گردش کر رہے ہیں جنہیں خفیہ مقامات پر ریکارڈ کیا گیا ہے۔ یہ گانے ان مایوس فوجیوں نے لکھے ہیں جو افغانستان میں لڑ رہے ہیں - ان گانوں کے انگریزی تراجم لاس اینجلز ٹائمز کے علاوہ نیویارک سے شائع ہونے والے ایک روسی زبان کے اخبار میں چھپ چکے ہیں - اندازہ ہے کہ اب تک ۴۰۰،۰۰۰ سوویٹ فوجی افغانستان میں اپنی خدمات سرانجام دے چکے ہیں - مایوسی کا یہ عالم ہے کہ جنگ کے خلاف روسی فوج خود افغانستان میں ایک خفیہ پرچہ (KRASNAYA ZVEZDA) نکالتے رہے ہیں - ۱۹۸۲ء کے آخر میں کابل میں اس کی جو کاپیاں تقسیم ہوئیں، ان کا عنوان تھا "جنگ بند کرو! ہمیں اپنے گھروں کو جانے دو!" ساتھ ہی ایک فوجی کی تصویر بنی ہوئی تھی جو اپنی کلاشنکوف توڑ رہا تھا - سرجی سنوانسکی کا خیال ہے کہ افغانستان کے باشندوں کو جس بے دردی سے کچلا گیا ہے، اس سے روسی فوجیوں کے گرتے ہوئے مورال کا اندازہ لگانا کچھ مشکل نہیں - جانی نقصانات جتنے بڑھے ہیں جنگ کی مخالفت بھی اتنی ہی تیز ہوئی ہے -

وطن لوٹنے والے فوجی روسی حکام کے لیے مسئلہ بنتے جا رہے ہیں - وہ خفیہ چھپنے والے اخباروں کو انٹرویو دیتے ہیں اور جنگ کی ہولناکیوں کے قصے جا بجا بیان کرتے ہیں - فوج کی ہائی کمان کے لیے جنگ سے عام نفرت ایک قضیہ بن چکی ہے - خطرہ ہے کہ ان احساسات نے سیاسی تحریک کی صورت اختیار کر لی تو یہ پورے سوویت معاشرے کو نلپٹ کر دے گی - سماجی بہبود کے ایک اعلیٰ روسی افسر نے تسلیم کرتے ہوئے کہا: "افغانستان سے لوٹنے والے

فوجیوں کے احساسات کا اندازہ ہمیں گذشتہ دو تین برسوں میں ہوا - وہ تھکے ماندے اور ذہنی طور پر مفلوج نظر آتے ہیں - لوگوں کی ہمدردیاں ان کے ساتھ ہیں " اگرچہ جنگ افغانستان کے فوجیوں کو اب جنگِ عظیم دوم میں حصہ لینے والے سابق فوجیوں کے برابر مراعات مل گئی ہیں، اس کے باوجود مسئلہ حل ہوتا نظر نہیں آتا - انہوں نے فوجی انداز میں افغانی دستے (AFGANTSI) بنا لیے ہیں جو سماج دشمن قوانین کے مقابلے میں " عدل وانصاف " فراہم کرنے کی کوشش کرتے ہیں - یہ کار آزمودہ فوجی روس کے نظام زندگی اور اس میں پائی جانے والی خرابیوں مثلاً رشوت، نوکرشاہی اور مغربی طرز کی فیشن زدگی سے سخت متنفر ہیں - ان کا دعویٰ ہے کہ روس کے گرے ہوئے معاشرے میں وہ اخلاقی طور پر برتر ہیں - اب تو انہوں نے خفیہ طور پر لوگوں کو تربیت دینی شروع کر دی ہے کہ بلیک مارکیٹ کرنے والوں، رشوت خور افسروں اور منشیات کے سرپرستوں سے کیسے نمٹا جائے - پراودا نے ان کی سرگرمیوں کے بارے میں لکھا - " یہ فوجی بداعتمادی کا شکار ہیں - وہ خود کو قانون نافذ کرنے والے اداروں کے نمائندے سمجھنے لگے ہیں - وہ ملک بھر میں اپنے قواعد وضوابط نافذ کرنا چاہتے ہیں " - اخبار کے مطابق افغانستان سے آنے والے ان فوجیوں کے منظم گروپ بڑے بڑے شہروں مثلاً ماسکو، نووسیبرسک اور پیٹروسک میں موجود ہیں -

جنگِ افغانستان سے نفرت کا اندازہ روس میں خفیہ چھپنے والے پرچوں سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے - ستمبر ۱۹۸۱ء میں نوشرکاسک کے شہر میں ایک اشتہار منظرِ عام پر آیا - اس میں شہریوں سے اپیل کی گئی تھی کہ وہ روس کی بیرونی مداخلت کے خلاف صدائے احتجاج بلند کریں ایک ماہ بعد ماسکو میں اسی نوعیت کا پوسٹر چھپا - اس پر یہ نعرہ درج تھا - پولینڈ اور افغانستان کو آزاد کرو " - لینن گراڈ سے سمرقند تک یہ اشتہار اب روزمرہ کا معمول بن چکے ہیں -

۱۵ جنوری ۱۹۸۰ء کو اقوامِ متحدہ کی جنرل اسمبلی نے افغانستان سے بیرونی فوجی دستے واپس بلانے کی قرارداد منظور کی - ماسکو ہلسنکی ناظر گروپ نے اس موقع پر اپنے تائیدی بیان میں کہا " روس میں بنیادی انسانی حقوق ناپید ہیں - وہاں کی لیڈرشپ ایسے فیصلے کر ڈالتی ہے جس کے دوررس اثرات تمام دنیا کو متاثر کرتے ہیں - یہ عظیم ترین ریاست جس طرح شخصی حقوق کا خیال نہیں کرتی،

اپنے لوگوں، ہمسایوں اور بالآخر دنیا کے انسانیت کے لیے ایک خطرہ بن گئی ہے۔" اس بیان پر دوسروں کے علاوہ معروف روسی منحرف آندرے سخاروف کے بھی دستخط تھے۔ گورکی میں جلاوطنی سے پہلے انہوں نے اے بی سی نیوز کے نمائندے کو انٹرویو دیتے ہوئے افغانستان سے روسی فوجوں کی واپسی کا مطالبہ دہرایا۔ پابندیوں کے باوجود سخاروف کی چند تحریریں بیرونی دنیا میں پہنچیں۔ انہوں نے اپنے ایک مضمون میں بتایا "فیصلے کرتے وقت قومی رہنماؤں کو یاد رکھنا چاہیے کہ ان کے عوام محاسبے کا حق رکھتے ہیں۔ ہم نہیں جانتے کہ افغانستان پر چڑھائی کا فیصلہ کس نے کیا اور کیوں کیا۔ ہماری سیاست کا دردناک پہلو یہ ہے کہ ہمارے قائدین صلح اور جنگ کے معاملات میں کسی کی رائے قبول نہیں کرتے۔ سچی بات یہ ہے کہ یہاں تنقید کا گلا دبا دیا گیا ہے۔" روس کے اندر سے اس آواز نے افغان مجاہدین کو ایک نیا حوصلہ عطا کیا۔ انہوں نے روسی حکمرانوں سے کہا کہ وہ سخاروف کی آزادی کے بدلے میں روس کے بعض جنگی قیدی ان کے حوالے کرنے کو تیار ہیں۔ روس کی جانب سے مجاہدین کی اس پیش کش کا جواب نہیں آیا۔

انسانی حقوق کی بحالی کے لیے روس میں متعدد تنظیمیں سرگرم ہیں۔ جون ۱۹۸۱ء میں اسٹونیا میں کسی "نیشنل ڈیموکریٹک فرنٹ" کی جانب سے ------ ایک میمورنڈم چھپا۔ خلاصہ یہ تھا "اس میں شبہ نہیں رہا کہ ہمارا ملک ایک بہت بڑی سامراجی قوت ہے۔ سرحد پار کی دوسری آزاد قوموں پر استعماری ہتھکنڈے اس کا معمول بن چکے ہیں"۔ ۱۹۸۰ء کے موسم گرما میں لینن گراڈ کی ایک تنظیم کی دو خواتین نے روسی نوجوانوں سے اپیل کی کہ وہ افغانستان کے بجائے جیل جانے کو ترجیح دیں۔ اس پر روسی حکومت اتنی بگڑی کہ ان خواتین کو گرفتار کر کے جبری طور پر ملک سے نکال دیا۔ مئی ۱۹۸۰ء میں لینن گراڈ "ماریا کلب" کی "افغان خواتین کمیٹی" نے ایک قرارداد منظور کی۔ اس میں کہا گیا تھا: "ہم خواتین اپنے ان حوصلہ مند بھائیوں کو خراج تحسین پیش کرتی ہیں، جو جنگ، تشدد اور بے انصافی کے خلاف مصروفِ عمل ہیں۔" جون ۱۹۸۱ء میں بچوں کے بین الاقوامی دن پر "تحریکِ امن" کے ایک رکن سرجی ٹرانسکی کی ایک اپیل منظرِ عام پر آئی: "ایک اشتراکی ملک میں ایک اجتماعی تحریک کو مزاحمت سمجھ کر کچل دینا غیر فطری لگتا ہے۔ ان تمام مشکلات کے باوجود یہ تحریک ہلاکت خیز ایٹمی ہتھیاروں، افغانستان میں مرنے اور زخمی ہونے والے افغان بچوں

اور وہاں جاری تباہ کن جنگ کے خلاف اپنی جدوجہد جاری رکھے گی"۔

۱۹۸۳ء میں ماسکو میں جنگِ افغانستان کے خلاف پہلا بڑا مظاہرہ ہوا۔ پولیس نے مظاہرین کو منتشر کر دیا۔ پکڑ دھکڑ دو دن جاری رہی۔ تقریباً دو سو افراد جیل میں بھیج دیے گئے۔ ایک غیر سرکاری تنظیم کے نمایاں رکن الغ رازنسکی اسی سال اکتوبر میں زیرِ حراست لیے گئے۔ ان کا قصور یہ تھا کہ انہوں نے روسی توسیع پسندی کی مذمت کی تھی۔ حکام نے رازنسکی پر یہ الزام بھی دھرا کہ وہ جنگ افغانستان کے بارے میں ایک ایسا فلمی سکرپٹ تیار کر رہے تھے جس میں روس کو ایک نازی طاقت کے روپ میں دکھایا گیا تھا۔ ایک روسی منحرف الغ الیفانوف پورے وثوق سے کہتے ہیں۔ "سوویت حکومت میں اگر جرأت ہے تو ریفرنڈم کرا کے دیکھ لے کہ عوام کی اکثریت افغانستان سے فوجی دستے واپس بلانے کے حق میں ہے۔ اس مداخلت کا عالمی اشتراکی انقلاب یا روس کی سلامتی سے کوئی تعلق نہیں"۔ لینن گراڈ کی ایک "جدید تحریکِ اشتراکیت" نے نومبر ۱۹۸۵ء میں اپنا منشور شائع کیا۔ (بحوالہ گارڈین۔ ۲۲ جولائی ۱۹۸۶ء)

"ہماری مسلح افواج تاریخ میں پہلی بار افغانستان میں ایک غیر اعلانیہ جنگ لڑ رہی ہیں۔ اس میں مایوسی کے سوا کچھ نہیں۔ اس جنگ سے سوویت یونین یا مسلح افواج کے وقار میں کوئی اضافہ نہ ہوگا"۔ "تحریک" کو شاید معلوم نہیں کہ روس نے آج تک کوئی اعلانیہ جنگ نہیں لڑی۔

لیتھونیا، لٹویا اور استونیا کی جمہوریتیں اہل افغانستان سے گہری ہمدردی رکھتی ہیں۔ افغانستان میں فوجی مداخلت کے ایک ماہ بعد ان ریاستوں کے اکیس[۲۱] "تحریک پسندوں" نے سپریم سوویت اور اقوام متحدہ کو ایک کھلا خط بھیجا۔ انہوں نے "سوویت افغان معاہدۂ دوستی" کا پول کھولتے ہوئے وضاحت کی۔ "بالٹک کے ممالک نے ایک وقت میں روس کے ساتھ دوستی اور باہمی تعاون کا معاہدہ کیا۔ ۱۹۴۰ء میں ان معاہدوں کی آڑ میں روس اپنے فوجی دستے لے آیا۔ یہاں کے مفتوح عوام روس کے ساتھ دوستی کے تلخ نتائج اب تک بھگت رہے ہیں"۔

جنگ افغانستان نے وسطِ ایشیا پر گہرے اثرات مرتب کیے ہیں۔ اسلام دشمن پروپیگنڈے کے باوجود یہاں افغان مجاہدین سے گہری ہمدردی پیدا ہو گئی ہے۔ سرحد کے دونوں جانب ایسی

قومیں آباد ہیں جو نسل اور مذہب کے لحاظ سے ایک رشتے میں منسلک ہیں۔ متعدد رپورٹوں سے معلوم ہوا کہ افغان مجاہدین وسطِ ایشیا جا کر اپنے بھائی بندوں سے ملاقاتیں کرتے اور اپنا لٹریچر بانٹتے ہیں۔ ۱۹۸۴ء میں وسطِ ایشیا کا دورہ کرنے والے ایک مغربی سیّاح نے اپنے ایک انٹرویو میں انکشاف کیا۔ "پہلی بار پتہ چلا کہ روس افغان سرحد کتنی غیر محفوظ ہے۔ افغان گوریلے بلا روک ٹوک رُوس میں داخل ہوتے ہیں۔ پہلے وہ یہاں صرف اپنا لٹریچر لاتے تھے، اب منشیات اور ہتھیار تک لانے لگے ہیں۔ انہیں مقامی لوگوں کا پورا تعاون حاصل ہے"۔ وسط ایشیا میں سوویت یونین کے خلاف خفیہ مواد شائع ہونے لگا ہے۔ ایک رُوسی اخبار نے تسلیم کیا کہ اس کے پیچھے افغان گوریلوں کا ہاتھ کارفرما ہے۔

وسطِ ایشیا میں جنگِ افغانستان کے اثرات تیزی سے پھیل رہے ہیں۔ اِسلامی جذبے کی رُوح پھر بیدار ہو گئی ہے۔ مسجدیں نمازیوں سے بھرنے لگی ہیں۔ لوگ اسلامی تعلیمات پر عمل پیرا ہو رہے ہیں۔ ایسی خفیہ تنظیمیں بن گئی ہیں، جن کی قیادت "ملاؤں" کے ہاتھ میں ہے۔ سمرقند میں مقیم ایک سابق افغان طالب علم نے ایک رسالے (ایشیا انفارمیشن بلیٹن اکتوبر ۱۹۸۵ء) کو انٹرویو دیتے ہوئے بتایا: "قازق، ترکمان، ازبک اور تاجک جمہوریتیں جو دراصل اسلامی ریاستیں ہیں، رُوس کی غلامی کا جوا اُتار پھینکنا چاہتی ہیں۔ یہاں کے مسلمانوں کی اکثریت افغانوں سے ہمدردی رکھتی ہے"۔ آذربائیجان جمہوریہ سے فوجی بھرتی اس لیے ختم کر دی گئی ہے کہ افغانستان آتے ہی یہاں کے فوجی مجاہدین سے جا ملتے ہیں۔ ۱۹۸۰ء میں ۱۰۶ تاجک فوجیوں کا دستہ محاذِ جنگ پر بھیجا گیا۔ جب انہیں پتہ چلا کہ وہ افغان بھائیوں کے خلاف صف آرا ہیں تو انہوں نے لڑنے سے انکار کر دیا۔ یہ فوجی واپس بھیج دیے گئے۔ بعض کو ان کے افسروں کے حکم پر موقع پر گولی مار دی گئی۔

۱۹۸۵ء میں ایک جرمن صحافی نے افغانستان میں ایک روسی تاجک بھگوڑے سے ملاقات کی۔ تاجک نے جرمن صحافی کو بتایا: "ہمارے نوجوان اپنے افغان بھائیوں کا خون نہیں گرا سکتے۔ روسی افسر انہیں جبری طور پر بھرتی کر کے افغانستان پہنچا دیتے ہیں۔ ستم یہ ہے کہ جنگ میں کام آنے والے وسطِ ایشیا کے مسلمانوں کو وہیں افغانستان میں دفن کر دیا جاتا ہے۔ رشتہ داروں کو

ان کی موت کی خبر تک نہیں دی جاتی"۔

۱۹۸۲ء کے وسط میں تاجکستان کے شہر دوشنبے سے پانچ افراد پکڑے گئے۔ وہ افغانستان پر روس کے قبضے کے خلاف پوسٹر تقسیم کر رہے تھے۔ ایک الزام یہ بھی لگایا گیا کہ وہ عوام کو بھڑکانے کے لیے ہلاک ہونے والے فوجیوں کی تعداد بڑھا چڑھا کر بیان کر رہے تھے۔ یو ایس ایس آر نیوز بریف (شمارہ ۵ ۱۹۸۴ء) کے مطابق ان افراد کا افغان گوریلوں سے رابطہ تھا۔ ۱۹۸۶ء میں اسی شہر دوشنبہ سے ایک خاتون سلوا دینسوف کی گرفتاری عمل میں آئی۔ الزام یہ تھا کہ وہ جنگِ افغانستان کے خلاف ایک دستخطی مہم چلا رہی تھیں۔ انہیں بعد میں دماغی امراض کے ہسپتال میں داخل کرا دیا گیا۔ روسی حکام تسلیم کرتے ہیں کہ وسطِ ایشیا میں صرف ایک گوریلا تنظیم حزبِ اسلامی کے تقریباً ۳۰۰۰ قومی ارکان موجود ہیں۔ جو تاجکستان اور ازبکستان میں حکومت کے خلاف پوسٹر شائع کرتے رہتے ہیں۔ (بحوالہ یو ایس ایس آر نیوز بریف شمارہ ۱۰ - ۱۹۸۶ء)

جون ۱۹۸۵ء میں استراخان کے شیشن نوجوانوں نے افغانستان میں فوجی خدمات سرانجام دینے سے انکار کر دیا۔ اس پر بڑا ہنگامہ ہوا۔ فوجی دستے موقع پر بلائے گئے۔ فائرنگ کا زبردست تبادلہ ہوا۔ فریقین کے بہت سے آدمی ہلاک یا زخمی ہوئے۔ حقیقت یہ ہے کہ جنگِ افغانستان نے روس کے اندر ایک دھماکا خیز صورتِ حال پیدا کر دی ہے۔ اگر یہ جنگ مزید عرصے تک جاری رہی تو روس کی اندرونی سلامتی کے لیے ایک خطرہ بن جائے گی۔

("تاراس کوزیو" "سنٹرل ایشین سروے" شمارہ ۱ ۱۹۸۷ء)

موجودہ طریقۂ انتخاب کی خرابیاں اور تدابیرِ اصلاح

جناب پروفیسر سید محمد سلیم صاحب

انسان ہمیشہ سے ایک معاشرہ میں زندگی گزارتا رہا ہے۔ معاشرہ میں کسی نہ کسی نوع کی حکمرانی بھی ہمیشہ سے موجود رہی ہے۔ حکمرانی کے لیے صلاح و مشورہ کی ضرورت کا احساس بھی قدیم دور سے چلا آرہا ہے۔ ملکہ سبا کا زمانہ آج سے تین ہزار سال قبل تھا۔ اس کا مقولہ قرآن مجید میں نقل کیا گیا ہے — "میں کبھی کسی معاملہ کا فیصلہ نہیں کرتی جب تک کہ تم لوگوں سے مشورہ نہ کر لوں" — اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس قدیم دور میں بھی حکمران مشورہ کو ضروری خیال کرتے تھے۔ اسی لیے قدیم تاریخ میں مختلف قوموں کے یہاں مجلسِ شیوخ، پنچائت (VILLAGE MOOT) کا پتہ چلتا ہے۔ یہ سب حکمرانوں کو مشورہ فراہم کرنے والے ادارے تھے۔

نیک بادشاہ ہو یا مطلق العنان یا جابر و ظالم، صلاح کار اور مشیر سب رکھتے تھے۔ وزیر کا وجود حکمرانی کا لازمی جزو سمجھا جاتا تھا۔ بغداد کو تباہ کرنے والے ہلاکو خاں نے بھی نصیر الدین محقق طوسی کو اپنا وزیر مقرر کیا تھا۔

قدیم زمانہ میں وزیر، مشیر اور صلاح کار بننے کے لیے علم، دانائی اور ذہانت کی صفات کا حامل ہونا ضروری تھا۔ ہر سمجھدار بادشاہ عالم اور دانا لوگوں کا گروہ اپنے گرد جمع کرتا تھا۔ اکبر بادشاہ کے نورتن (نوموتی) ایسے ہی دانا لوگ تھے۔ اکبر بادشاہ کے وزراء میں ایک ہی

خاندان کے دو افراد، ابوالفضل اور فیضی شامل تھے۔

دانائی اور معاملہ فہمی کی صفت کی قدیم زمانہ میں جس قدر اہمیت تھی۔ جدید دور میں اسی قدر ناقدری ہے۔ جدید دور میں علاقائی بنیادوں پر منتخب ہو کر افراد مجلسِ مشاورت میں پہنچتے ہیں اس لیے ضروری نہیں ہے کہ وہ عالم ہوں، دانا ہوں اور معاملہ فہم ہوں۔ جدید دور نے دانائی اور معاملہ فہمی کے مقابلہ میں علاقائی نمائندگی کو ترجیح دی ہے۔ یہاں ضرور یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا علاقائی نمائندہ ایک دانا اور معاملہ فہم سے افضل ہوتا ہے؟ بہترین حکومت کے نقطۂ نظر سے ان دونوں میں سے کون افضل ہے؟ اقبالؒ کا فیصلہ تو اس سلسلہ میں واضح ہے۔

سہ گریز از طرزِ جمہوری، غلامِ پختہ کارے شو
کہ از مغزِ دو صد خر فکرِ انسانے نمی آید

قدیم مشیروں اور صلاح کاروں میں اور جدید نمائندگان میں ایک اہم فرق اور ہے۔ قدیم دور میں حکمران بادشاہ ہوتا تھا۔ صلاح کار وزیر ہوتا تھا۔ مشیروں پر ان کی حیثیت واضح ہوتی تھی کہ وہ وزیر ہی رہیں گے، بادشاہ نہیں بن سکتے۔ اس لیے بڑی حد تک وہ اغراض سے بلند ہو کر حکمران کو صحیح مشورہ دیتے تھے۔ جدید دور میں علاقائی نمائندہ صرف مشیر ہی نہیں ہوتا، بلکہ تشکیلِ حکومت میں شریک اور حصہ دار بن سکتا ہے۔ یہ لالچ اس کی سوچ کو، اس کے طرزِ عمل کو متاثر کرتا ہے۔ وہ بے لاگ مشورہ دینے کے بجائے وزیرِ اعلیٰ یا وزیرِ اعظم کی ہاں میں ہاں ملانے کو ترجیح دیتا ہے۔ تملق اور خوشامد کا بازار ماضی میں ہی گرم نہیں رہتا تھا۔ جدید دور میں بھی گرم رہتا ہے۔

انتخاب کا موجودہ طریقہ ساری دنیا میں انگلستان سے اخذ کیا گیا ہے۔ اسی وجہ سے انگلستان کی پارلیمان کو مادر پارلیمان کہا جاتا ہے۔ انگلستان کی پہلی دستوری دستاویز میگنا کارٹا (MAGNA CHARTA - 1215) میں یہ اصول طے کیا گیا:

NO TAXATION WITHOUT REPRESENTATION

"علاقائی نمائندگان سے مشورہ کیے بغیر بادشاہ کو محصول لگانے کا حق نہیں ہے۔"

یہاں سے علاقائی نمائندگی کا اصول تسلیم کیا گیا۔ اور پھر پارلیمان کی تشکیل علاقائی نمائندگان سے کی گئی۔ مگر یہ سب مختلف علاقوں کے امراء اور نواب ہوتے تھے۔ جو وراثتی انداز میں ممبر بنتے تھے۔ ہندوستان کی دولت سے صنعتی انقلاب برپا ہونے اور ملک میں بڑے بڑے کارخانے لگ جانے کے بعد معاشرہ کی روایتی تشکیل میں خلل واقع ہو گیا۔ امراء اور نوابین کی اہمیت کمتر ہو گئی۔ اور تاجروں اور سرمایہ داروں کی اہمیت بڑھ گئی۔ محصولات کے نقطۂ نظر سے ظاہر ہے بھی دوسرے طبقہ کی اہمیت زیادہ ہے۔ تاجر اور سرمایہ دار وراثتی نواب نہیں تھے۔ بلکہ نو بنو تبدیل ہوتے رہتے تھے، اس لیے ان کے انتخاب کے لیے رائے کا ذریعہ استعمال کیا گیا۔ برطانوی پارلیمان میں انتخابات پہلے امراء اور نوابین کے نقطۂ نظر سے ہوتے تھے، بعد میں سرمایہ داروں اور تاجروں کے نقطۂ نظر سے ہونے لگے۔ ذہین، عالم اور معاملہ فہم کی صفات جو عالمِ مشرق میں درکار تھیں وہ برطانیہ میں اول روز سے مقصود نہیں تھیں۔ پھر عوام کے نقطۂ نظر کو سمجھنے کی کوشش کی گئی۔ ۱۸۳۲ء میں پہلی مرتبہ عوام کی بالغ رائے دہی کی جانب اہم قدم اٹھایا گیا۔ رائے دہندہ پر کوئی مالی شرائط عاید کی گئی تھیں۔ ۱۹۱۱ء میں پہلی مرتبہ بالغ رائے دہی کا حق تسلیم کیا گیا۔ انگلستان دنیا کا پہلا ملک تھا، جس میں بالغ رائے دہی کا طریقہ رائج ہوا۔

ہندوستان میں انگریزی حکومت نے ۱۸۸۲ء میں علاقائی نیابت کے اصول کو رائج کیا۔ رائے دہندہ کے لیے ضروری تھا کہ وہ پانچ ہزار کی مالیت کا حامل ہو۔ جب کہ ہندوستان میں فی کس آمدنی چھ پائی تھی، پانچ ہزار آمدنی والے رائے دہندگان بہت کم تھے۔ آج ہندوستان اور پاکستان دونوں جگہ بالغ رائے دہی کا اصول رائج ہے۔

علاقائی نیابت کے اصول میں یہ بات مضمر ہے کہ منتخب وہ شخص ہو، جو اس علاقہ میں صاحبِ اثر ہو۔ غالباً قانون سازوں کے ذہن میں "صاحب اثر" کا مفہوم یہ ہے کہ وہ اس علاقہ میں نیک نام ہو، اچھی شہرت کا مالک ہو، عزت و وقار کا مستحق ہو۔ ان وجوہ کی بناء پر علاقہ میں ہر دلعزیز ہو اور مقبول ہو۔ مگر عملاً صورتِ حال یہ ہوتی ہے کہ منتخب ایسا شخص ہوتا ہے جو دولت مند ہوتا ہے۔ اور اپنے انتخاب کے سلسلہ میں رائے دہندگان پر روپیہ خرچ کرتا ہے۔ وقتی طور پر ان کو خوش کر دے۔ وقتی طور پر رقوم دے کر ان کو خرید لے۔ بعض وہ لوگ ہوتے

ہیں جو اپنی قوت اور طاقت سے عوام کو ڈرا دھمکا کر ووٹ حاصل کر لیتے ہیں - یہ عموماً علاقے کے زمیندار اور وڈیرے ہوتے ہیں - پولیس کا جن کے ساتھ گٹھ جوڑ ہوتا ہے -

یہ وہ بات ہے جو اس طریقۂ انتخاب کو رائج کرنیوالوں اور قانون سازوں کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھی - مگر اب سب لوگ بے بس نظر آتے ہیں - اور سب نے اس بدترین طریقہ کو گوارا کر لیا ہے -

دوسری بڑی خرابی کی جڑ یہ علاقائی نیابت کا اصول ہے - علاقہ نیابت میں اولین اہمیت علاقہ کے لوگوں کو مطمئن کرنا ہے - ان کی فلاح و بہبود کو اولین اہمیت دینا ہے - اس طرح علاقے کی بنیاد پر منتخب ممبران کی سوچ علاقائی، وقتی اور ہنگامی ہو جاتی ہے - وہ ملکی، اصولی اور اخلاقی معاملات کو اہم نہیں سمجھتے - اس فرق کو ہم اس مثال سے سمجھ سکتے ہیں کہ ایک لڑکا جب کہتا ہے کہ میں پتنگ اڑاؤں تو اُس کی سوچ وقتی اور ہنگامی ہے، باپ جب کہتا ہے کہ تعلیم حاصل کر تو اُس کی سوچ اصولی اور دُور رس ہے - اب اگر زندگی کے معاملات میں علاقائی اور ہنگامی سوچ کا غلبہ ہو جائے تو معاملات ضرور خراب اور ابتر ہو جائیں گے - علاقائی نیابت کا طریقہ علاقائیت، تنگ دلی کو پروان چڑھاتا ہے - اور ملکی اور اصولی معاملات کو پسِ پشت ڈال دیتا ہے -

علاقائی نیابت کا ایک خراب نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ مجلسِ مشاورت میں اعلیٰ افکار، اعلیٰ قابلیت کا کوئی شخص شامل نہیں ہو سکتا - علاقائی اور ہنگامی کاموں کے سامنے اس کے اعلیٰ افکار، اس کی اصولی باتیں عوام کو اپیل نہیں کرتیں - لہٰذا بسا اوقات ایک تماشا باز کے مقابلہ میں ایک اعلیٰ کردار و افکار کا شخص ناکام ہو جاتا ہے - اور اب تو کھلاڑی اور اداکار سیاست میں آ رہے ہیں - ان کی مقبولیت کے مقابلے میں کوئی بھی دوسرا شخص کامیاب نہیں ہو سکتا - کیا فی الواقع وہ اداکاری اور کھیل کی مقبولیت تھی، جو قانون سازوں کے پیشِ نظر تھی - اس طرح نیابتی طریقہ انتخاب میں ارکان کی علمی، اخلاقی، کرداری سطح پر بھی بتدریج نیچے گرتی رہتی ہے - اسمبلی میں وہ لوگ پہنچتے ہیں، جن کا علم محدود، جن کی نظر کوتاہ، جن کا مبلغ علم ناقص ہوتا ہے -

کسی ملک کی یہ بدبختی ہوگی کہ قومی قیادت بونوں پر مشتمل ہو، ایک بھی ان میں بلند قامت

دیوزاد نہ ہو۔ ممکن ہے کہ آرام سے چلتی گاڑی کو تو چلا لے جائیں، لیکن اگر موڑ آگیا، چڑھائی آگئی یا تصادم ہو گیا تو ایسے لوگ گاڑی نہ چلا سکیں گے۔ مسلمانوں کی قومی قیادت جس نے بیک وقت دو محاذوں پر جنگ لڑی، انگریزوں کے خلاف اور ہندوؤں کے خلاف، وہ دیو قامت لوگ تھے۔ سرسید احمد خان، مولانا محمد علی جوہر، علامہ اقبال اور قائداعظم محمد علی جناح وہ لوگ علم و عمل کی صلاحیتوں اور استعدادوں کے لحاظ سے منفرد اور یگانہ قسم کے لوگ تھے۔

ممبران جب اسمبلی میں پہنچ جاتے ہیں تو پوری کوشش کرتے ہیں کہ وزراء کے گروہ میں شامل ہوں۔ وزراء چند ہی ہو سکتے ہیں اور ممبران ہوتے ہیں کئی سو کی تعداد میں۔ ظاہر ہے کہ ان کے درمیان مسابقت ہوتی ہے، سازشیں ہوتی ہیں۔ چغل خوریاں ہوتی ہیں۔ وزیر اگر نہ بن سکا تو وہ کوشش کرتا ہے کہ کسی طاقتور وزیر کے گروہ میں شامل ہو جائے اور آئندہ کے لیے زمین ہموار کرے۔ ان حالات میں بہت کم ممبر ایسے ہوں گے جو اس دوڑ دھوپ سے علیحدہ رہیں۔ سوائے ان لوگوں کے جو کھلم کھلا حزبِ اختلاف میں شامل ہوں۔ اب ذرا غور فرمائیے کہ جو لوگ اس قسم کی سخت دوڑ میں شریک ہوں، کیا وہ غیر جانب دار اور صحیح مشورہ دے سکتے ہیں۔

اور اگر کبھی کسی جانب سے صائب اور مفید مشورہ پیش بھی کیا جائے تو پارٹی ڈسپلن کی چھڑی پارٹی کے اندر بولنے والوں کو خاموش کر دینے کے لیے کافی ہے۔ پارٹی کے باہر سے اگر صائب مشورہ آئے تو پارٹی کو ان کا مشورہ ماننے میں عار آتا ہے۔ تقسیم سے قبل سندھ میں کانگریس کی حکومت تھی۔ انہوں نے بندشِ شراب کا بل پیش کیا تو مسلم لیگ کے مسلمان ممبروں نے جماعتی عصبیت کی وجہ سے اس کی مخالفت کی اور قرآن کے احکام کی بھی پروا نہیں کی۔

غرض کہ علاقائی نمائندگی کے اصول نے جمہوریت کی گاڑی کا رخ علاقائیت، عصبیت، تنگ نظری اور کم علمی اور بے اصولی کی طرف موڑ دیا ہے۔ ہر نئے انتخاب کے بعد جمہوریت کی گاڑی اس راہ پر دو چار قدم اور آگے بڑھ جاتی ہے۔

حکمرانی میں شرکت کے لالچ نے قومی مشیروں کو مشورہ دینے کی صلاحیت اور منصفانہ کردار سے محروم کر دیا ہے۔ آج کے دور میں پارلیمان درحقیقت جوڑ توڑ کا اڈہ ہے۔ شطرنج کی بساط پر چالاک شاطر اپنی ذہانت کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ دینی اور ملی مقاصد، اخلاق و کردار

کے تقاضے، ملکی مفاد سب ذاتی اغراض کی قربان گاہ پہ مذبوح رہتے ہیں۔
اس نوع کے قومی مقاصد کا تذکرہ کرنے پر سامع کی جانب سے عموماً یہ جملہ سننے کو ملتا ہے

"نقارخانے میں طوطی کی آواز کون سنتا ہے"

یہ جملہ برف کی ایک سل ہے جو نوخیز اُبھرتے ہوئے مصلحِ کے دل و دماغ پر آکر گرتی ہے۔ اور یخ بستہ کر دیتی ہے۔ وہ بے قرار رُوح منجمد ہو کر رہ جاتی ہے۔ آیئے پہلے اس جملہ کا تجزیہ کیجیے۔

پہلے ایک مسلمان کی حیثیت سے سوچیے۔ حق کی آواز ہمیشہ نقار خانہ میں طوطی کی آواز ہوتی ہے۔ سارے ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیاء نقار خانوں میں صدا لگاتے رہے۔ ظلمت کدوں میں دیئے جلاتے رہے۔ کامیابی و ناکامی اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے۔ ہم ان نبیوں کے پیرو کار ہیں ہمیں بھی یہ آواز بلند کرنا چاہیے۔ اور یہ دیئے روشن کرنے چاہئیں۔ نہ نقاروں سے گھبرانا چاہیے، نہ ظلمتوں سے ڈرنا چاہیے۔

ایک اور جملہ ہے جو ایسے موقع پر سامع کی جانب سے سننے کو ملتا ہے۔

"اکیلا چنا کیا بھاڑ پھونک سکتا ہے" —— یہ جملہ بھی یاس و قنوطیت کا مظہر ہے۔ یہ جملہ غلط ہے۔ اکیلا چنا بھاڑ پھونکے نہ پھونکے مگر ایک فرد کام کر گزرتا ہے۔ قوم کو بیدار کر ڈالتا ہے۔ تنِ مردہ میں زندگی کی رُوح دوڑا دیتا ہے۔ جدید مغربی علوم کی اشاعت کے لیے ایک فرد سرسید احمد خاں نے کمر ہمت باندھی اور اپنے زمانہ کا مخالفانہ رویّہ ختم کر دیا۔ آج جو مغربی علوم کی بہار آئی ہوئی ہے وہ ایک ہی باہمت فرد کی لائی ہوئی ہے۔ آزاد خطۂ زمین پاکستان کا تصور ایک فلسفی شاعر نے پیش کیا تھا۔ ایک صاحبِ عزیمت رہنما قائد اعظم محمد علی جناح نے اس تصور کو حقیقت کی شکل دینے کا بیڑا اُٹھایا اور بالآخر پاکستان آج دُنیا کے نقشے پر موجود ہے۔ کیا یہ سب ایک ایک فرد کے کارنامے نہیں ہیں۔ صاحبِ عزیمت انسان اور صاحبِ عزیمت قوم سب کچھ کر سکتی ہے۔ ناممکن کو ممکن بنا سکتی ہے۔

بلاشبہ ایک بیج کو درخت بننے میں اور درخت کو پھل دینے میں ایک مدت درکار ہوتی ہے۔ اس کے لیے مسلسل اور پیہم محنت کے ساتھ طویل صبر اور انتظار کی ضرورت ہوتی ہے اور

عجلت پسند انسان ہتھیلی پر سرسوں جمانا چاہتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ اِدھر وہ بیج پھینکے اور اُدھر پھل لگنے لگے۔ دراصل خرابی کا مرکز اس کا اپنا ذہن ہے۔ اس کی اصلاح کرنی چاہیے۔

بہرکیف ملک وملت کے ہمدرد اور بہی خواہ افراد کا فرض ہے کہ وہ قومی اور ملکی مسائل پر مسلسل غور وخوض کرتے رہیں، حالات کا تجزیہ کرتے رہیں۔ مسائل کا حل اور خرابیوں کا علاج سوچتے رہیں۔ اور پھر اپنے نتائجِ افکار کو قوم کے سامنے پیش کرتے رہیں، مسلسل پیش کرتے رہیں تاآنکہ چشمِ نابینا بینا ہو جائے۔ اور گوشِ گوش شنوا بن جائے۔ خاص طور پر یہ فریضہ ملت کے اہلِ علم اور اہلِ فکر افراد پر عاید ہوتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے۔

ومن لم یھتم باموراالمسلمین فلیس منا۔ — جو شخص مسلمانوں کے معاملات سے دلچسپی نہیں رکھتا وہ ہم میں سے نہیں ہے۔

اسی جذبہ کے تحت ذیل میں چند تجاویز پیش کی جاتی ہیں۔ اربابِ علم اور اربابِ اقتدار شاید انہیں درخورِ اعتنا سمجھیں۔

۱— قومی اسمبلی کی اصل حیثیت مجلسِ مشاورت کی ہے۔ اس حیثیت کو اوّلیت دی جائے۔ قومی، ملکی اور ملی مسائل اور مفادات پر آزادانہ گفتگو کی جائے۔ ضابطہ کی پابندیوں سے بولنے والوں کا گلا نہ گھونٹا جائے۔ صدرِ مجلس کی حیثیت وزیرِ اعظم سے ہرگز فروتر نہ ہو۔

۲— علاقائیت کے مقابلہ میں مشاورت کو اہمیت دی جائے۔ معاملہ فہم اور پیش بین افراد کو اسمبلی میں لانا چاہیے جیسے علماء، پروفیسر، وکلاء جو اپنے ماحول میں نیک ہوں۔

۳— اسمبلی کا ممبر بننے کے لیے چالیس سال عمر کی شرط ہونا چاہیے۔ اس عمر میں جذباتیت کم ہو جاتی ہے۔ اور معاملہ فہمی کی صفت پیدا ہو جاتی ہے۔ اور عورت کے لیے ۶۰ سال کی شرط ہونی چاہیے۔ اس عمر میں وہ خانگی امور سے بے نیاز ہو کر ملکی اور ملی مسائل پر توجہ دے سکتی ہے۔

۴— علاقائی نمائندگی کے مقابلے میں اسمبلی میں ایک تعداد ایسے افراد کی ضرور ہونی چاہیے۔

جو کُل کی نمائندگی کریں۔ صوبائی اسمبلی میں کُل صوبے کے نمائندے ہوں اور قومی اسمبلی میں کُل ملک کے نمائندے ہوں۔ اس کا فائدہ یہ ہوگا کہ جہاں دوسرے لوگ علاقائی مفاد کی باتیں کریں، وہاں ایک تعداد ایسی بھی ہو جو پورے صوبے اور پورے ملک کے مفادات کی باتیں کریں۔ جو ملکی مفادات اور اصولی و اخلاقی تقاضے پیش کریں۔ یہ لوگ کس طرح اسمبلی میں پہنچیں، اس کے لیے طریقۂ کار سوچنا چاہیے۔

۵ ـــ علاقائیت کا رجحان کم کرنے کے لیے ایک تدبیر یہ ہوسکتی ہے کہ صوبائی انتخابات میں صرف اس پارٹی کو شرکت کی اجازت ہو جس کی شاخیں صوبہ کے تمام اضلاع میں سرگرمِ عمل ہوں، وہ ایک صوبائی جماعت ہو۔ اسی طرح قومی انتخابات میں صرف اس جماعت کو شرکت کا موقع دیا جائے جس کی شاخیں ملک کے تمام صوبوں میں قائم ہوں۔ وہ ایک قومی جماعت ہو۔ اس طرح قومی سوچ اُبھرے گی۔ اور علاقائی تنگ دلی کم ہوگی۔

۶ ـــ حکومت چلانے کے لیے مضبوط اور مستحکم پارٹی چاہیے۔ اور اکثریت کی حامل ہونی چاہیے۔ اگر پہلے انتخاب میں واضح اکثریت حاصل نہ ہو تو پھر دوبارہ انتخابات کرانے چاہئیں تاکہ واضح اکثریت حاصل ہو۔

۷ ـــ اور یہ بات تو سب سے زیادہ اہم ہے کہ اگر ملک و قوم کو تباہ کرنا نہیں چاہتے تو براہ مہربانی دھونس دھاندلی، سازش، حکومت کا دباؤ جیسے عوارضات کو ختم کرو۔ آزادانہ جمہوری روایات کو کام کرنے کا موقع دو۔

یہ اور اسی قسم کی تجاویز کے حق میں رائے عام کو بیدار کرنا قوم کے بہی خواہوں اور اہلِ فکر لوگوں کا کام ہے۔

روہنگیا تنظیم کا خبر نامہ[1]

انگریزی سے ترجمہ از جناب آسی ضیائی صاحب

اراکان، برما کے مسلمانوں کا خبر نامہ

نوٹ:۔ شمارہ اوّل جلد پنجم، شائع شدہ اگست ۱۹۸۷ء۔ آپ کو دسمبر میں مل رہا ہے تاہم اس سے اندازہ کر لیجیے کہ پلوں کے نیچے سے اور کتنا پانی اب تک گزر چکا ہوگا

(ادارہ)

ناموسِ نسائیت پر حملہ

۲۴ اکتوبر ۱۹۸۶ء کو ۱۱½ بجے شب، تونگ بازار فوجی کیمپ، متعلقہ نمبر ۲۰ انفنٹری رجمنٹ، برانچ نمبر ۳ کے دو فوجی، بوتھی ڈونگ ٹاؤن شپ کے گاؤں ایکمائی میں ایک شخص عبدالرحیم کے گھر میں زبردستی گھس گئے۔ اور اس کی بیوی ۲۶ سالہ عمر خاتون کی آبروریزی کی۔ جب پڑوس کے دیہاتیوں نے میاں اور بیوی کی چیخیں سُنیں تو انہوں نے گھر کو گھیر لیا اور ایک فوجی کو پکڑ لیا، مگر دوسرا جیسے تیسے نکل گیا۔ پھر مجرم کو تونگ بازار فوجی کیمپ کے حوالے کر دیا گیا۔ مگر بجائے اس کے کہ بدکاروں کے خلاف کوئی کارروائی کی جاتی، فوج کے افسر نے گاؤں کی کونسل کے بودھ چیئرمین ماونگ لوون کی مدد سے گیارہ روہنگیا جوانوں کو گرفتار کر لیا کہ انہوں نے فوجیوں پر آبروریزی کا جھوٹا الزام لگایا ہے۔ اگلے دن فوجیوں نے بہت سے اور دیہاتیوں کو بھی بُری طرح زدوکوب کیا۔ بعد افسروں نے گرفتار شدہ روہنگیا جوانوں

---

[1] شائع شدہ بہ اہتمام ڈاکٹر محمد یونس شعبہ نشرواشاعت، روہنگیا سالیڈیریٹی آرگنائزیشن۔ اراکان۔ برما۔

پر اس قدر وحشیانہ تشدد کیا کہ اُن میں سے کئی مستقلاً اپاہج ہوگئے۔ پولیس تھانے میں بھی آبروریزی کی رپورٹ کی گئی مگر مجرم کے خلاف کوئی مقدمہ نہیں بنایا گیا۔ ان روہنگیا جوانوں کو طویل عرصے تک بوتھی ڈونگ تھانے میں زیرِ حراست رکھا گیا، جہاں ان پر مسلسل تشدد کیا جاتا رہا۔ اور پھر اُن کے خلاف مقدمہ درج کرلیا گیا۔ سُنا ہے کہ اگست ۱۹۸۶ء کے پہلے ہفتے میں وہ ضمانت پر رہا ہوئے۔

تشدد سے موت

خوش حال روہنگیوں سے رقم اینٹھنے کے لیے برمی فوج ہمیشہ ان پر الزام لگاتی رہتی ہے کہ وہ زیرِ زمین مخالفِ حکومت تحریک کی باغیانہ سرگرمیوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان پر اتنا تشدد کیا جاتا ہے کہ وہ اس ناقابلِ برداشت تعذیب سے خود کو چھڑانے کے لیے بھاری رقمیں دینے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ ان میں سے ایک واقعہ حسبِ ذیل ہے:

۲۷ مئی ۱۹۸۶ء کو رات کے دو بجے ۵۵ انفنٹری رجمنٹ سے متعلق تونگ بازار فوجی کیمپ کے چار مسلح افراد ۳۰ سالہ نور احمد ولد عبدالمنان مرحوم ساکن موضع ایکمائی، بوتھی ڈونگ ٹاؤن شپ کے گھر میں گھس گئے، اُسے پکڑ کر بُری طرح پیٹا، پھر اُسے تونگ بازار فوجی کیمپ لے گئے جہاں اُس پر یہ جھوٹا الزام لگایا گیا کہ وہ پچھلے پانچ سال سے ایک باغی گروپ کی خدمت بطور ڈاکٹر کر رہا ہے۔ پھر اس پر اس بے رحمی سے تشدد کیا گیا کہ اس کے منہ، ناک اور کانوں سے بے تحاشا خون جاری ہوگیا، جس سے وہ بے ہوش ہوگیا۔ ہوش آنے پر وہ پھر وحشی برمی سپاہیوں کا تختۂ مشق بنا۔ نور احمد اتنا غریب تھا کہ خود کو جنگلی برمی فوج سے فدیہ دے کر چھڑا نہ سکتا تھا۔ تب اُس پر مسلسل پانچ دن تونگ بازار اور بوتھی ڈونگ فوجی کیمپوں میں تشدد کیا جاتا رہا کہ وہ اعتراف کرلے کہ وہ باغیانہ سرگرمیوں میں ملوث تھا۔ اور ان چند روہنگیوں کے نام بتا دے جن کے متعلق فوجی ٹاؤٹوں نے رپورٹ دی تھی کہ ان کا تعلق باغیوں سے ہے، لیکن اتنی شدید تعذیب سہنے کے باوجود بے گناہ نور احمد نے نہ تو باغیوں سے تعلق رکھنے کا اعتراف کیا اور نہ کسی کا نام لیا کہ وہ باغیوں کا حامی ہے۔ بعد میں وہ زخموں کی تاب نہ لا کر یکم جون ۱۹۸۶ء کو دس بجے صبح چل بسا۔ فوجی افسر، کیپٹن آئے لون، ۵۵ انفنٹری رجمنٹ نے اُس کی میت بوتھی ڈونگ ہسپتال بھجوائی اور ٹاؤن شپ کے ایک بدھ میڈیکل آفیسر سے پوسٹ مارٹم کرا کر تصدیق حاصل کی کہ

نور احمد پیٹ کی بیماری سے مرا ہے۔ فوج نے پہلے تو نور احمد کی میت چھپانے کی کوشش کی مگر پھر اس نے رشتہ داروں سے دستخط لے کر، کہ وہ محض پیٹ کی بیماری سے مرا ہے میت کو نماز جنازہ اور تدفین کے لیے ان کے حوالے کیا۔ کپتان آئے لون نے مرحوم کی بیوہ ہزارہ خاتون اور بیوہ کے باپ سے بھی زبردستی دستخط لیے کہ نور احمد صرف پیٹ کی بیماری سے مرا ہے۔

ایک معصوم کنواری لڑکی کی مظلومیت

۳۰ جون ۱۹۸۰ء کو، عید کے دن فُردنگ پھرو فوجی کیمپ کے دو برمی فوجی ایک ۵۵ سالہ شخص اخلاص میاں سکنہ کلّا ربیل KULLARBEEL مونگ ڈاؤ ٹاؤن شپ، کے گھر میں رات کے بارہ بجے گھس گئے اور اس کی کنواری ۱۸ سالہ بیٹی کی، بہ نوکِ سنگین، آبرو ریزی کی۔ جب گھر میں سے شور و ہنگامہ سنائی دیا تو گاؤں والے گھر کے گرد جمع ہو گئے اور دونوں بدکاروں کو پکڑ لیا۔ اور پھر ان کو فردنگ پھرو فوجی کیمپ کے حوالے کر دیا، اور ان کے اسلحہ چھین کر مونگ ڈاؤ پولیس تھانے میں جمع کرا دیے۔ مجرموں کے خلاف کوئی کارروائی کرنے کے بجائے پولیس نے دیہی کونسل کلا ربیل مونگ ڈاؤ ٹاؤن شپ کے سیکرٹری امام حسین اور دو اور دیہاتیوں مولوی نذیر احمد اور محمد سعید کو گرفتار کر لیا۔

ڈکیتی

۲ جولائی ۱۹۸۰ء کو آدھی رات کے وقت ماٹرولا پولیس چوکی کے تین پولیس مین گاؤں کے تین غنڈوں کے ہمراہ مونگ ڈاؤ ٹاؤن شپ کے گاؤں گورا کھالی کے ایک شخص عبدالحکیم کے گھر میں زبردستی گھس گئے۔ اور گھر والوں کو بُری طرح زدوکوب کرنے کے بعد تقریباً دس ہزار ڈالر مالیت کا قیمتی سامان لوٹ لیا۔ چیخنے اور مار پیٹ کا شور سن کر گاؤں والے گھر کے گرد جمع ہو گئے۔ دو پولیس والے اور وہ تینوں غنڈے تو نکل بھاگے، مگر ایک پولیس والا رنگے ہاتھوں غضب ناک گاؤں والوں کے ہتھے چڑھ گیا۔ پھر اس مجرم کو قریبی فوجی کیمپ میں دے دیا گیا۔ اگلے دن ماٹرولا پولیس چوکی کی کچھ پولیس نفری کے ساتھ ٹاؤن شپ کونسل کے کچھ ممبر اس گاؤں میں گئے اور لگے دیہاتیوں کو مارنے پیٹنے۔ انہوں نے اس گاؤں کی کونسل کے مسلمان چیئرمین کے گھر پر بھی فائر کیے۔ کیونکہ اسی نے مجرم کو فوج کے حوالے کیا تھا۔ اس ڈکیتی کی رپٹ مونگ ڈاؤ تھانے میں درج کرائی گئی۔ مگر مجرموں کے خلاف کارروائی کرنے کے بجائے حکام نے کئی دیہاتیوں پر مقدمے دائر کر دیے۔

مسلم خواتین سے کھیت بیگار برمی بنانے کی پالیسی کے تحت برمی حکام اراکان میں بسنے والے روہنگیا مسلمانوں کی ثقافت اور روایات بدل ڈالنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔ مزید برآں، کم سن مسلمان طالبات کو، اُن کے والدین کے پُرزور اعتراض کے باوجود، دھان کے کھیتوں میں مرد مزدوروں کے ساتھ کام کرنے پر مجبور کیا جاتا ہے۔ حال ہی میں ۱۱ر جولائی ۱۹۸۶ء کو مونگ ڈاؤ ٹاؤن شپ کے گاؤں ناگونا کی کچھ روہنگیا عورتوں اور کچھ اسکولوں کی لڑکیوں کو زبردستی گھروں سے نکال کر مرد مزدوروں کے ساتھ دھان کے کھیتوں میں کام کرنے پر مجبور کیا گیا۔

قتلِ بے محابا مانو میاں ولد عبدالکریم اور فُوک وِنّا ولد اصغر علی سکنہ کونہ پاڑا، مونگ ڈاؤ ٹاؤن شپ اسی گاؤں کے ڈیم میں ماہی گیری کرتے تھے۔ ساتھ کے ساتھ وہ اس ڈیم پر کام بھی کرتے تھے اور اس کی دیکھ بھال بھی۔ ۱۵ جولائی ۱۹۸۶ء کو کیان ڈان (آلی تھنکیا) فوجی کیمپ کے دو مسلح افراد نے اُن کی دن بھر کی مشقت سے پکڑی ہوئی تمام مچھلیاں چھین لینی چاہیں جب ان غریبوں نے مزاحمت کی تو دن میں ۴ بجے شام آٹومیٹک رائفل سے دونوں کو گولی مار دی گئی۔ بعد میں دونوں کی نعشیں مونگ ڈاؤ تھانے میں ان کے رشتہ داروں نے پہنچا دیں اور قاتلوں کے خلاف رپورٹ درج کرا دی۔ مگر قاتلوں کے خلاف مناسب کارروائی تو درکنار، اُلٹا اُن رشتہ داروں کو نعشیں تدفین کرانے کی خاطر واپس لینے کے لیے پولیس حکام کو خاصی رقم بھرنی پڑی۔

رسائل و مسائل

کیا انبیاؑ ایک ہی خطّہ میں بھیجے گئے ؟

جناب ملک غلام علی صاحب ۔ منصورہ ۔ لاہور

سوال :- میں ایک مسئلہ آپ کی خدمت میں ارسال کر رہا ہوں ۔ اُمید واثق ہے کہ آپ اپنی پہلی فرصت میں جواب دے کر مشکور فرمائیں گے اور آپ نے جو دینی اور علمی شمع جلائی ہوئی ہے وہ اسی طرح جلتی رہے گی ۔ آپ کی درازیٔ عمر، صحت اور خوشحالی کے لیے دُعاگو ہوں ۔

میرے خیال کے مطابق دُنیا میں تقریباً پانچ ارب انسان رہتے ہیں ۔ صحیح تعداد معلوم نہیں ۔ ان میں تقریباً ایک ارب مسلمان ہیں ۔ ہمارے عقیدے کے مطابق اسلام اللہ تعالیٰ کے ہاں سب سے مقبول مذہب ہے ۔ جتنے نبی آئے وہ سب اسلام کی تبلیغ کے لیے آئے ۔ وہ نبی بھی ایک خصوصی خطے میں تشریف لائے اور سب اسلامی مُلک ایک ہی مخصوص خطے میں واقع ہیں ۔

۱ ۔ کیا اللہ تعالیٰ نے ایک مخصوص خطے میں ہدایت دینی تھی؟ اس لیے اس خطے میں نبی بھیجے گئے ۔

۲ ۔ سب لوگوں کو مسلمان کیوں نہیں کیا ۔ اس کی وجہ کیا ہے ؟

جواب :- آپ نے لکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے جتنے نبی آئے وہ دُنیا کے ایک مخصوص خطے میں تشریف لائے ۔ آپ کے اس مفروضے سے آپ کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہوا ہے کہ کیا اللہ تعالیٰ ایک خاص خطّے کو اسلام کی ہدایت سے سرفراز کرنا چاہتا تھا ؟ اگر آپ کے سوال کا

جواب میں ذرا تفصیل سے دینا چاہوں تو یہ ایک مضمون کی شکل اختیار کر جائے گا۔ اس لیے میں مختصر جواب پر اکتفا کرتا ہوں اور اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہوں کہ آپ کا اطمینان اس سے ہو جائے۔

سب سے پہلے تو یہ امر میں آپ کے ذہن نشین کراؤں گا کہ اللہ تعالیٰ نے مختلف زمانوں میں دنیا کے ہر خطے اور ہر قوم میں اپنا کوئی نہ کوئی نبی بھیجا ہے اور اس پر اس کی اپنی زبان میں وحی نازل فرمائی ہے تاکہ وہ لوگوں کو راہ راست کی طرف بلائے اور گمراہی سے بچائے۔

چنانچہ قرآن میں فرمایا ہے:

إِنَّمَا أَنتَ مُنذِرٌ وَلِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ (الرعد ۔ ۷) — تم ڈرانے والے ہو اور ہر قوم کے لیے ایک ڈرانے والا ہوتا ہے۔

وَإِن مِّنْ أُمَّةٍ إِلَّا خَلَا فِيهَا نَذِيرٌ (فاطر ۔ ۲۴) — کوئی اُمت ایسی نہیں ہو گذری جس میں ایک ڈرانے والا مبعوث نہ ہو چکا ہو۔

وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِينَ حَتَّىٰ نَبْعَثَ رَسُولًا (الاسرا ۔ ۱۵) — ہم کسی قوم کو (نافرمانی پر) عذاب نہیں دیتے جب تک کہ ایک رسول نہ بھیجیں۔

قرآن مجید ہی سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض رسولوں کے اسماء اور حالات سے آنحضورؐ کو آگاہ فرمایا گیا اور بعض سے نہیں فرمایا گیا۔

مِنْهُم مَّن قَصَصْنَا عَلَيْكَ وَمِنْهُم مَّن لَّمْ نَقْصُصْ عَلَيْكَ (المؤمن ۔ ۷۸) — ان میں سے بعض کے حالات ہم نے آپ کو بتلائے اور ان میں سے بعض کے نہیں بتائے۔

اس میں جو حکمت ہماری سمجھ میں آتی ہے وہ یہ کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن مجید کے براہ راست مخاطب یعنی مشرکین عرب (یا پھر اہل کتاب) جن انبیاء اور کتب سماویہ کے ناموں سے واقف تھے ان کا ذکر تو صراحت کے ساتھ قرآن و حدیث میں آگیا۔ اور ان کی تعلیمات میں جو تحریف تھی اسے بھی واضح فرما دیا لیکن جن کتب و رسل سے اہل عرب بالکل ناآشنا تھے، ان کے اسماء و کوائف کو حذف کر دیا۔ اس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ ان لوگوں کے کان تو

پہلے اسی بات پر کھڑے ہو گئے تھے کہ سارے خداؤں اور معبودوں کو چھوڑ کر بس ایک الٰہِ واحد کی بندگی ہم کیسے کریں - اس پر اگر انہیں بعض ایسی کتابوں اور رسولوں کے نام بتائے جاتے جن سے وہ ناواقف تھے اور ان پر ایمان لانے کا مطالبہ کیا جاتا تو وہ اور زیادہ متوحش ہوتے اور کفر و عناد میں ان کے زیادہ سخت ہونے کا امکان تھا - اگر یہ اولین مخاطب ہی دولتِ ایمان سے محروم رہتے تو دوسروں کے لیے ہدایت کا وسیلہ کیسے بنتے ؟

اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے انسان اور ابوالبشر حضرت آدم علیہ السلام کو نبی بنا کر بھیجا مگر قرآن و حدیث کی کسی نصِ صریح میں یہ ذکر نہیں کہ خلافتِ ارضی عطا کیے جانے کے بعد انہیں کس خطۂ زمین میں اُتارا گیا - تقریباً یہی صورت حضرت نوحؑ کے معاملے میں ہے - قرآن مجید سے صرف اتنا معلوم ہوتا ہے کہ طوفان کے بعد ان کی کشتی جودی پہاڑ پر جا ٹھہری تھی - ان دو مثالوں کے بیان کرنے سے میرا مدعا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ان دو عظیم المرتبت نبیوں کے بارے میں قرآن و حدیث میں یہ صراحت نہیں فرمائی گئی کہ زمین کے کس حصے میں انہوں نے دعوت کا آغاز فرمایا تھا - اس کی وجہ بھی یہی معلوم ہوتی ہے کہ ان دونوں کے ناموں سے تو عرب واقف اور متعارف تھے، مگر انہیں ان کی قدیم تاریخی روایات بھی یہ نہیں بتاتی تھیں کہ کس خطۂ ارضی میں ان کی بعثت ہوئی -

آپ کا یہ سوال پوری طرح سمجھ میں نہیں آیا کہ اللہ نے سب لوگوں کو مسلمان کیوں نہیں کیا ؟ بات تو یہ ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اوّلین انسان اور ابوالبشر کو خلعتِ نبوت سے سرفراز فرما کر دنیا میں بھیجا اور حضرت آدم کی اولاد ایک اُمتِ مُسلمہ تھی مگر انسان کو چونکہ ایک محدود دائرے میں ارادہ و عمل کی آزادی دی گئی، اس لیے رفتہ رفتہ انسان غفلت اور اختلاف کا شکار ہوئے اور ہدایت پا لینے کے باوجود گمراہی و نافرمانی میں مبتلا ہو گئے - چنانچہ فرمایا:

وَمَا كَانَ النَّاسُ إِلَّا أُمَّةً	لوگ ایک ہی اُمت تھے مگر انہوں نے
وَاحِدَةً فَاخْتَلَفُوا (یونس - ۱۹)	باہم اختلاف پیدا کر لیا......

دوسرے مقام پر اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

فَمَا اخْتَلَفُوا إِلَّا مِنْ بَعْدِ	لوگوں نے علمِ وحی آجانے کے بعد اختلاف

مَا جَآءَهُمُ الْعِلْمُ بَغْيًا بَيْنَهُمْ (الجاثیہ - ۱۷) کیا - کیونکہ وہ ایک دوسرے پر زیادتی کرنا چاہتے تھے۔

اس سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بلاواسطہ یا بالواسطہ ہر انسان کی ہدایت کا سامان فراہم کر دیا ہے اور سیدھے رستے کی نشان دہی کر دی ہے۔ اب اگر کوئی انسان کفر و ضلالت کی راہ اختیار کرتا ہے تو وہ خود ہی اس کے لیے ذمہ دار و مسئول ہے۔

آخر میں یہ بات قابلِ وضاحت ہے کہ مختلف قوموں اور ملکوں میں جو مذہبی رہنما مانے گئے ہیں اور وہ ہمارے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے گزر چکے، مگر ان کے نبی ہونے یا نہ ہونے کا ذکر قرآن و حدیث میں وارد نہیں، ان کی نبوت کے بارے میں ہمیں سکوت اختیار کرنا چاہیے۔ ممکن ہے کہ وہ خدا کے نبی ہوں مگر ان کی تعلیم میں تحریف ہو چکی ہو اور ممکن ہے کہ ایسا نہ ہو۔

---

(۲)

عورتوں کا بال کٹوانا

جناب مولانا عبدالمالک صاحب - منصورہ - لاہور

سوال: - تازہ شمارہ ترجمان القرآن میں بہن فہمیدہ نے بیوٹی پارلر کھولنے اور بال کاٹنے کے بارے میں دو سوال کیے ہیں۔

آپ نے پہلے سوال کا تو بہت شافی اور اچھا جواب دیا ہے، مگر دوسرے سوال، بال کاٹنے کے بارے میں سکوت فرما گئے ہیں۔ حالانکہ مجھے دوسرے سوال سے زیادہ دلچسپی تھی۔ کیونکہ آجکل بال کاٹنا فیشن کا نام پاکر ایک وبا کی صورت میں پھیل گیا ہے اور پھیل رہا ہے اور اس کا جواز لوگ یہ کہہ کر رد کر دیتے ہیں کہ نہ تو قرآن اور نہ ہی حدیث میں اس کی واضح حرمت آئی ہے اور نہ ہی منع کیا گیا ہے۔

اس لیے براہ مہربانی بال کاٹنے کے بارے میں سیر حاصل مواد فراہم کیجیے تاکہ ذہنوں کو خلجان سے نجات ملے اور دلائل دیئے جا سکیں۔

جواب :- محترمہ فہمیدہ صاحبہ کے سوال "کیا بال کاٹنا گناہ ہے اگر چٹیا موجود ہو صرف سامنے سے تھوڑی سی لٹیں کاٹ دی جائیں تو یہ بھی ناجائز ہے" کے متعلق آپ نے تفصیلی جواب دینے کے متعلق تحریر فرمایا ہے جو درج ذیل ہے۔

حدیث میں ایسی عورتوں پر لعنت کی گئی ہے جو اپنی فطری خلقت میں بناؤ سنگار کی خاطر تبدیلی کرتی ہیں۔ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے گودنے والیوں گدوانے والیوں، نوچنے والیوں نچوانے والیوں، حسن کی خاطر دانتوں میں کشادگی پیدا کرنے والیوں اللہ کی خلقت میں تبدیلی کرنے والیوں پر لعنت فرمائی ہے۔ ایک روایت میں "الا من داء" مگر بیماری کی وجہ سے استثنا آیا ہے جس نے مزید وضاحت کر دی کہ طبی وجوہ کی بنا پر اس کی اجازت ہے۔ اسی طرح ایسی عورتوں پر جو مردوں سے مشابہت کرتی ہیں اور ایسے مردوں پر جو عورتوں سے مشابہت اختیار کرتے ہیں اور اس بنا پر ایک دوسرے کا لباس پہنتے ہیں اس پر بھی لعنت کی گئی ہے۔

ان احادیث کے پیش نظر علماء نے عورتوں کے لیے فیشن کی خاطر بالوں کا کاٹنا حرام قرار دیا ہے۔

قال ابوجعفر الطبری فی هذا الحديث دليل على انه لا يجوز تغيير شيء مما خلق الله المراة عليه او نقص التماسا للتحسين لزوج او غيره -

(فقه السنة ج ۳ ص ۴۹۷)

ابوجعفر طبری نے کہا ہے کہ اس حدیث میں دلیل ہے کہ عورت کے لیے جائز نہیں ہے کہ وہ فطری خلقت میں کمی بیشی کر کے تبدیلی کرے شوہر یا کسی دوسرے کے لیے حسین و جمیل بننے کی خاطر۔

درمختار میں ہے "قطعت شعر راسها اثمت ولعنت" عورت اپنے سر کے بالوں کو کاٹے تو گناہ گار اور ملعون ہوگی" اگرچہ شوہر نے اس کی اجازت دی کیونکہ خالق کی معصیت میں کسی کی طاعت نہیں ہے۔" "درمختار" رد المحتار ج ۶ ص ۴۰۷)

پس کسی عورت کا سامنے یا پیچھے سے تھوڑے سے بال کاٹنا بھی خوب صورت بننے کی خاطر منع ہے۔

درد مندانہ اپیل

ایک لڑکا مسمی مظہر اقبال عابد ولد محمد علی پٹواری سکنہ میلو تحصیل پھالیہ ضلع گجرات بعمر ۱۳، ۱۴ سال قصبہ جوکالیاں میں آٹھویں جماعت میں پڑھتا تھا۔ اور گھر پر میرے لڑکے رفیق احمد سے قرآن مجید کا ترجمہ بھی پڑھتا تھا۔ لڑکا طبعی طور پر دیندار اور نمازی تو تھا ہی۔ قرآن کریم کا ترجمہ پڑھنے سے رسوم بدعیہ سے متنفر ہو گیا۔ اور جب اس کے گھر والوں نے سختی کی تو فرار ہو کر جامعہ اسلامیہ گارڈن ٹاؤن لاہور چلا آیا جہاں اس کے گاؤں کے تین لڑکے پہلے ہی زیر تعلیم تھے۔ مظہر اقبال کا والد میرے لڑکے کو لے کر اس مدرسہ میں پہنچا تو اسے اپنا لڑکا مل گیا۔ جسے وہ واپس گھر لے گئے اور جا کر مزید سختی شروع کر دی۔ ہمارے گھر آنے جانے اور گفتگو تک پر پابندی لگا دی۔ دو ماہ بعد ۱۴ اکتوبر کو لڑکا پھر فرار ہو کر کسی نامعلوم جگہ پر چلا گیا۔ اب ڈیڑھ ماہ سے روپوش ہے۔ میں، میری اولاد اور لڑکے کے لواحقین نے پاکستان کے بڑے بڑے شہروں کے مدارس کو چھان مارا۔ مگر اس کا سراغ نہیں مل سکا۔ اس سلسلہ میں ہفت روزہ الاعتصام، اہل حدیث اور "اسلام" میں مراسلے بھی شائع کرائے گئے۔

دریں اثنا مظہر اقبال کے دو خط بھی آئے پہلا اپنے والد کے نام جس میں لکھا ہے۔ میں ایک حافظ صاحب کے پاس قرآن حفظ کر رہا ہوں حفظ ہونے پر ہی گھر آؤں گا، پہلے نہیں۔ آپ میری فکر نہ کریں نہ ہی میرا پیچھا کریں، دوسرا خط گاؤں کے ایک ماسٹر صاحب کے نام تھا جس میں چند اختلافی مسائل کی تحقیق کا ذکر تھا۔ اس کا پتہ کسی خط پر درج نہیں۔

اب امر یہ ہے کہ لڑکے کا والد مجھے اور میری اولاد کو اصل مجرم سمجھتا ہے اور کہتا ہے کہ تم ہی نے میرے لڑکے کو اغوا کیا ہے۔ حالانکہ ہم کئی بار اپنی برأت میں قسمیں دے چکے ہیں۔ مگر وہ کہتا ہے کہ یا تو میرا لڑکا برآمد کرکے دو یا ساڑھے ہزار روپے تم سے ہرجانہ وصول کروں گا۔ اب میں اور میرے گھر والے سخت مصیبت میں مبتلا ہیں۔ دن رات لڑکے کی تلاش بھی کرتے ہیں اور [illegible] بھی سمجھتے ہیں۔ ہمارا جرم ایک یہ ہے تو یہ کہ [illegible] اور ہم کمزور ہیں۔ دوسرا جرم یہ کہ میرے لڑکے رفیق احمد نے اسے چند پاروں کا ترجمہ پڑھا دیا تھا۔

اب آپ سے ہماری درد مندانہ اپیل یہ ہے کہ اس بچے کی تلاش میں ہماری مدد کریں۔ پوری کوشش سے اس کا سراغ نکالنے کی کوشش فرما کر عنداللہ ماجور ہوں۔ اور اگر کچھ پتہ چلے تو درج پتہ پر ہمیں اطلاع دیں۔ اللہ تعالیٰ اس ذہنی ابتلا سے ہمیں جلد از جلد نجات بخشے آمین۔ والسلام

پتہ: حاجی محمد شریف سکنہ میلو۔ ڈاک خانہ کوٹ ستار شرقی۔ براستہ جوکالیاں ضلع گجرات

اکتوبر ۱۹۸۹ء

رجسٹرڈ ایل نمبر ۵۳۴۰

تفہیمات یورپ

— از —

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ

○ کتاب : جس کا آپ کو عرصے سے انتظار تھا

○ کتاب : جو رسائل کے دامن میں بکھر کر کھو گئی تھی

○ کتاب : جو معانی کا سمندر اور دعوتِ اسلامی کا قلزم اپنے دامن میں رکھتی ہے

○ کتاب : جو اسلام کی دعوت لے کر یورپ کی بستی بستی میں جانے کا جذبہ اور داعیہ پیدا کرتی ہے

○ کتاب : جو آپ کے بے شمار سوالات کے تسلی بخش جواب دیتی ہے

○ کتاب : جو ملحدانہ ماحول اور مادہ پرستانہ فضا میں توحید کی آواز بلند کرتی اور روحانیت کی شمع روشن کرتی ہے

○ کتاب : جو دورِ حاضر میں اسلامی انقلاب کی بانگِ درا ہے

○ کتاب : جس کے بغیر مولانا مودودیؒ کا لٹریچر آپ کے پاس نامکمل ہے

ضخامت: ۲۵۶ صفحات ○ سائز: ۲۰ × ۳۰ / ۱۶

قیمت: -/۱۸ روپے

ادارہ ترجمان القرآن (پرائیویٹ) لمیٹڈ

اُردو بازار ○ لاہور